اشعار ہین، جو مختلف اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی ترجمانی کرتے ہین، ایران کے بعض اہلِ نظر اس کی اخلاقی نظمون کو وہی درجہ دیتے ہین، جو ابن یمین کی نظمون کا ہے، لائق مؤلف نے ان خواتین شعراء کے فارسی اشعار کے انگریزی ترجمے بھی دیئے ہین، جن سے انگریزی دان طبقہ کو ان فارسی اشعار کی خوبیون کے سمجھنے مین بڑی سہولت ہوگی، مؤلف کی تحریر مین اختصار ضرور ہے، لیکن اس کا اندازِ بیان دلنشین ہے، اصل کتاب تو ۹۴ صفحے مین ختم ہوگئی ہے، لیکن اس مین ۱۵ صفحے کا ضمیمہ ہے، جس مین ایران اور ہندوستان کی تقریباً سو خواتین شعراء کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کے نمونے ہین، اس کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے رکھی گئی ہے، اس سلسلہ مین لائق مؤلف نے نورجہان کی طرف بعض ایسے اشعار منسوب کردیے ہین، جو اس کے نہین ہوسکتے، مثلاً حسبِ ذیل شعر اسی کا بتایا گیا ہے،

نورجہان گرچہ بصورت زن است

لیک بباطن زنِ شیرافگن است

بعض تذکرون مین یہ شعر اسی کی طرف منسوب ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس کا کہا ہوا نہین ہوسکتا، کسی نے اس پر یہ شعر کہدیا ہوگا، جو اس کے نام کے ساتھ مشہور ہوگیا، اسی طرح لائق مؤلف نے عالمگیر کی لڑکی زیب النساء کے بہت سے اشعار نقل کئے ہین، جن مین کوئی بھی اس کا نہین، مولانا شبلی نے بعض تذکرون کی سند پر صرف ایک رُباعی زیب النساء کی طرف منسوب کی تھی، لیکن پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے معارف نمبر ۵ جلد ۱۱ کے ایک مقالہ مین اس کو بھی مشکوک بتایا ہے، اس لئے اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ زیب النساء شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق ضرور رکھتی تھی، لیکن اس کا سارا کلام ضائع ہوگیا اور اس کا کوئی شعر ہم تک نہین پہنچ سکا، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے،

"ص ع"

جلد ۶۸ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

شذرات

محرم کا مہینہ ہر سال مسلمانوں کے لئے پیام غم بھی لاتا ہے، اور حیاتِ نو کی بشارت بھی، اس سال ایک نیا کوہِ الم اپنے ساتھ لایا، اور اسی مہینہ کی ۱۶ تاریخ کو کسی شقی نے لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کی شمعِ حیات گل کر دی، اُن کی شہادت تنہا پاکستان کا نہیں دنیائے اسلام کا نہایت دردانگیز سانحہ ہے، بدبخت قاتل نے ایک شخص کو نہیں مارا، بلکہ ملک و ملت کے ایک مضبوط ستون کو ڈھا کر اُس کی پوری عمارت کمزور کرنے کی کوشش کی، اور ایک پوری قوم کو ماتم گسار بنا دیا،

لیاقت علی خان کی موت نے پاکستان کو ایک ایسے مدبر اور معمار قوم سے محروم کر دیا، جس کا بدل بظاہر مدتوں ملنے کی امید نہیں، وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک، بڑے مدبر، ہوشمند، یورپ کی سیاست کے نباض، بین الاقوامی سیاست کے ماہر اور ٹھنڈے دل و دماغ کے انسان تھے، قائد اعظم کی وفات کے بعد انہوں نے جس کامیابی کے ساتھ پاکستان کو چلایا، اور چند برسوں کے اندر اس نئی مملکت کو جس درجہ پر پہنچا دیا، وہ اُن کا بڑا کارنامہ اور اُن کے تدبر اور ہوشمندی کا ایسا نمایاں ثبوت ہے جس کا اعتراف ساری دنیا نے کیا، اس لحاظ سے وہ معمار پاکستان تھے، اُن کی شہادت نے اُن کا درجہ اور بلند کر دیا، یہ سعادتِ عظمیٰ ہر شخص کا حصہ نہیں،

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہان

انہوں نے اندرونی طور سے پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنایا، بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کر کے اسکی حیثیت

منوائی، دنیائے اسلام سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا اور ان کو ایک سلسلہ مین منسلک کرنے کی کوشش کی، ہندستان اور پاکستان کے تعلقات مین جب کوئی نازک موڑ آیا، تو اپنے اعتدال توازن اور سلامت روی سے اس کو خطرہ سے بچایا، گذشتہ فسادات کے موقع پر اگر اُن کی ذات درمیان مین نہ ہوتی، تو معلوم نہین دونون ملکون کی کشمکش کا انجام کیا ہوتا، مہاجرین کو بھی اُن سے تقویت تھی، غرض اُن کے کارنامے گوناگون ہین، اور ان کی جیسی جامعیت کا وزیر اعظم مشکل سے پاکستان کو ملے گا، مگر اشخاص کی موت خواہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیون نہ ہو زندہ قومون کو کمزور نہین کرتی، بلکہ اُن کے قوائے عمل کو اور زیادہ بیدار کر دیتی ہے، شہید کا خون جسم ملت کے لئے روحِ حیات ہے، اس لئے پاکستان اس حادثہ سے سبق لے کر اپنی کمزوریون کو دور کر کے نئی زندگی حاصل کر سکتا ہے، اور معمارِ پاکستان کے خون سے اسکی عمارت اور زیادہ مستحکم ہو سکتی ہے،

مرحوم متحدہ ہندوستان کی پیداوار تھے، اور تقسیم سے پہلے انہون نے ہندوستان کی خدمات بھی انجام دی تھین اگرچہ اب ہندوستان اور پاکستان سیاسی حیثیت سے دو ملک ہو گئے ہین لیکن وہ ایک ہی جسم کے دو ٹکڑے ہین، اس لئے جب تک موجودہ نسلین باقی ہین، دونون کی بڑی شخصیتین ایک دوسرے کی مشترک ملک ہین، اس لئے ہندوستان بھی پاکستان کے اس درد و الم مین برابر کا شریک ہے، اللہ تعالیٰ اس شہید ملت کی تربت پر اپنی رحمت و مغفرت کے پھول برسائے، اور قوم کے ان نادانون کو ہدایت دے، جن کو اپنے نفع و نقصان کا بھی امتیاز نہین، اور وہ اپنے ہاتھون اپنی قوم کو نقصان پہنچانے مین بھی باک نہین کرتے،

ہمارے صوبہ کی حکومت نے اردو کو علاقائی زبان کے حق سے بھی محروم کر کے جس اردو دشمنی کا ثبوت دیا ہے، وہ اوس کی دیانت اور انصاف پسندی کا شاہکار ہے، اس سے بڑھ کر اس کے وہ بعض نمکخوار ہین جنھون نے اردو کو اپنی مادری زبان مانتے ہوئے محض سرکار کی خوشنودی کے لئے اس مسئلہ مین

مین حکومت کی ہمنوائی کی، اس قسم کے عجائبات نئے نہین ہین، حکومت کی راہ مین جب دین وایمان تک بک جاتا ہے، تو زبان کی کیا حیثیت ہی،

اس بارہ مین اگرچہ بحث ودلیل بے کار ہے، تاہم یہ سوال کئے بغیر نہین رہا جاتا کہ اگر اردو اس صوبہ کی علاقائی زبان بھی نہین ہے، تو پھر "آزاد قومی حکومت" سے پہلے "اجنبی حکومت کی غلامی" کے زمانہ مین تعلیم مین اردو اور ہندی کا درجہ کیون برابر تھا، اور ہندی کے مقابلہ مین اردو پڑھنے والے طالب علمون کی تعداد کیون زیادہ تھی، اور حکومت کے بڑے اور مرکزی شعبون کو چھوڑ کر عدالت، پولیس، جیل، صیغۂ مال، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ تمام صوبائی محکمون اور اُن کے دفترون کا سارا کاروبار اردو مین کیون ہوتا تھا، بلکہ ریلوے اور ڈاکخانہ جیسے مرکزی محکمون مین بھی انگریزی کے بعد ہندی اور اردو کا درجہ برابر تھا، جس کی تصدیق آج بھی پُرانے رکارڈ سے ہوسکتی ہے، بلکہ اب بھی بہت سے شعبون مین اس سخت جان کے نقشِ قدم باقی ہین، مگر جن لوگون کا نقطۂ نظر ہی یہ ہو کہ ہندی کی ترقی کے لئے اردو کو مٹانا ضروری ہی، اُن کے سامنے منطق ودلیل بے کار ہی، مگر یہ نقطۂ نظر خود اس کا ثبوت ہی کہ اس صوبہ کی عام اور مقبول زبان اردو ہی ہی، اور اس مین ہندی سے زیادہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی، ورنہ ہندی کی ترقی کے لئے اردو کا گلا کاٹنے کی ضرورت نہ پیش آتی،

اس زیادتی کا آخری علاج یہی ہی کہ اردو زبان کو علاقائی زبان منوانے کے لئے دس لاکھ دستخطون سے مرکزی حکومت کو میمورنڈم بھیجا جائے، یہ مسئلہ خالص لسانی ہی، بہت سے ہندو بھی اردو کو اپنی زبان مانتے ہین، اور وہ کم از کم علاقائی زبان منوانے مین ضرور ساتھ دین گے، اس لئے اس صوبہ کی اتنی بڑی آبادی مین دس لاکھ دستخط حاصل کر لینا کچھ مشکل نہین ہی، صرف مستعدی کی ضرورت ہی، انجمن ترقی اردو اس کام کو شروع کر رہی ہی، اردو کے تمام حامیون کو اسکا ہاتھ بٹانا چاہئے،

مقالات

ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی

از
مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۲)

بہرحال گو ہمارے اس مظلوم مولوی نے پرانے مذاق کے مولویون ہی سے ان ہی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی، جن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج مسلمانون کی پُرانی درسگاہون مین تھا، لیکن اپنی ذاتی جدوجہد اور مطالعہ ومحنت سے یورپ کے جدید افکار وخیالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی باخبر تھے، اسلام اور مسلمانون پر مسلمانون کی تاریخ پر، اعتراضات اور تنقیدون کا جو نیا سلسلہ یورپ کی جدید علمی نشأت مین جاری ہوا تھا، صرف اسی سے وہ واقف نظر نہین آتے، بلکہ کائنات کے متعلق جو قدیم طریقۂ تصور تھا، اس مین وقتاً فوقتاً ترمیم واصلاح مغربی حکما، کی طرف سے ہوتی چلی آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے کی کوشش مین وہ سرگرم تھے،

ان ہی باتون کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی تفسیر کے اس مقدمہ مین علم کلام اور تصوف کے پرانے مباحث مثلاً اثباتِ واجب، توحید، وحدتِ وجود، وحدتِ شہود، امثال حشر ونشر، جنت ونار، ملائکہ جن، رسالت، وحی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ تعددِ ازدواج، غلامی، جہاد جیسی چیزون کا ذکر بھی ملتا ہے، حد یہ ہے کہ ان ہی جدید وقدیم مباحث کے انبار مین آپ کو اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے کے اس الزام کا تذکرہ

بھی ملے گا، جو مسلمانون کی تاریخ پر یورپ والوں کی طرف سے لگایا گیا تھا، یہ لکھ کر کہ

"یہ امر محض غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسکندریہ کا قدیم کتب خانہ جلا دیا"

اپنے خیال کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

"جیسے گبن، وسینٹ کرائی، ڈیوٹارک، اسکی تصریح کرتے ہین، بلکہ کتب خانہ مذکور سیزر

قیصر کے وقت جلایا گیا، (مقدمہ ص ۱۴)

جس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا یورپین مصنفین کی کتابون یا اُن کے تراجم کے مطالعہ کا مصنف کو موقع ملا تھا، کچھ بھی ہو، انیسوین صدی کے ایک ہندوستانی مولوی کی تفسیر مین گبن، اور ڈیوٹارک کے نامون کا تذکرہ یہی بتاتا ہے کہ مولویون کا جو عام ماحول اس زمانہ مین تھا، اسی ماحول مین محدود رہنے کا جو غلط رجحان لوگون مین پایا جاتا ہے، کم از کم ہمارے اس مظلوم مولوی کا دامن اس داغ سے پاک ہے،

بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ بیسوین صدی مین جن نظریات کو یورپ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، انیسوین صدی کے اس مولوی کے کلام مین اُن کی طرف بھی اشارے پائے جاتے ہین، مثلاً یہی آواز یا صوت کا مسئلہ ہے، قدیم فلسفہ مین آواز کو غیر قار ٹھہرایا گیا ہے، یعنی پہلا جز جب تک اس کا معدوم نہ ہو جائے اس وقت تک دوسرا جزو موجود نہین ہو سکتا، برعکس اس کے آج یہ مسئلہ عام ہو چکا ہے کہ ہر پیدا ہونے والی آواز فضا مین موجود ہے، چاہا جائے تو ہزار ہا ہزار سال کی تقریرون کو بھی اس زمانہ کا آدمی سُن سکتا ہے، اس مین شک نہین کہ مسلمانون کے بعض اربابِ کشف آج سے صدیون پہلے اسی دعوی کا اعلان کر چکے تھے، شیخ ابن عربی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ جن کی وفات ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء یعنی تقریباً سات سو سال پہلے ہو چکی تھی، مشہور کتاب فتوحاتِ مکیہ مین یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

وھذا الحروف لا یزال فی الھواء یمسک علیھا شکلھا،

یہ حروف (جو منہ سے نکلتے ہین) ہمیشہ اُن کی شکل ہوا مین قائم و دائم رہی ہے،

آگے چند سطرون کے بعد لکھتے ہین کہ

الاشکال اللفظیۃ فی محل لا یقبل ذلک ولھذا کان لھا البقاء،

الفاظ کی صورت و ہیئت جس چیز مین جا کر قائم ہو جاتی ہے، چونکہ وہ زوال پذیر نہین ہے اس لئے الفاظ کی صورت اور ہیئت ہمیشہ باقی رہتی ہے،

آخر مین اس حقیقت کا اظہار فرماتے ہین کہ

فالجو کلہ مملوء من کلام العالم،

ساری فضا دنیا والون کی باتون سے بھری ہوئی ہے،

اور اسی حقیقت تک آج سائنس بھی پہنچ چکی ہے، شیخ نے لکھا ہے کہ ساری فضا کا دنیا والوں کی باتون سے مملو اور بھرا ہوا ہونا، یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ

یراہ صاحب الکشف صورا قائمۃ،

کشف کی قوت رکھنے والے آوازون کی صورتون کو فضا مین قائم و دائم پاتے ہین

(دیکھئے فتوحاتِ مکیہ جلد اول ص۴۲۲ مطبوعہ مصری)

خیر یہ تو شیخ اکبر کا ایک کشفی نظریہ ہے، اسی فتوحاتِ مکیہ کے دوسرے مقامات مین بھی اس کی طرف انھون نے اشارہ کیا ہے، یہان مین کہنا چاہتا ہون کہ ہمارے مظلوم مولوی نے اپنے مقدمۂ تفسیر مین شیخ اکبر کے اسی نظریہ کا تذکرہ کرتے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے کہ قرآنی آیت

ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید،

نہین بولتا ہے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے،

سے بھی آدمی کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے،

آگے وہی لکھتے ہین کہ

"قیام آواز موجود ہوائی کا اُس وقت ہین اُڈ حفاظت آواز سے ظاہر ہوا ہے" (ص ۶۲)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آواز کے اس جدید نظریہ سے یورپ والون کے وہ واقف تھے، حالانکہ جہان تک میرا خیال ہے کہ ان کے زمانہ مین یہ مسئلہ اپنی ابتدائی حالت مین تھا، نئی باتون کے جاننے کا غیر معمولی جذبہ ان مین جو بھڑک اٹھا تھا، اس کے سوا اس قسم کی واقفیتون مین اور کس چیز کو دخیل مانا جائے،

اسی طرح آج کل یورپ والون نے اپنی تنقید کے لئے اسلام کے جن مسائل کا انتخاب کر رکھا ہے، جن مین دہی تعدد ازدواج، غلامی، جہاد کے سہ شاخے کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اگرچہ اُن مین سے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اسلام کے ساتھ کسی قسم کی خصوصیت رکھتا ہو، دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب یا مذہبی قوم ایسی ہوگی، جس کا دامن ان دھبون سے پاک ہو، بشرطیکہ ان کو واقعی انسانیت کے دامن کا دھبہ قرار دیا جائے، مگر اسلام ہی کو نشانہ بنا کر دو سو سال سے پلٹ پلٹ کر اعتراض کرنے والے ان ہی کو دہراتے ہین، جواب دے دیا جاتا ہے، مگر جب دیکھئے اسلام کے مقابلہ مین صلیبی محاذ سے اسی سہ شاخے (تعدد ازدواج، غلامی، جہاد) کو لئے ہوئے لوگ حملہ کر رہے ہین، پہلے اس صلیبی ہتھیار کو پادری استعمال کرتے تھے، اس زمانہ مین تحقیق و ریسرچ کی نقاب ڈال کر ان ہی پادریون کی اولاد داد تحقیق دے رہی ہے،

بہرحال معمولی لفظی رد و بدل کے ساتھ پیش کرنے والے کا انتہائی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کے ساتھ اسی کو اس طرح پیش کرتے رہتے ہین کہ گویا اُن کا کوئی جواب مسلمانون کی طرف سے کبھی دیا ہی نہین گیا تھا،

کچھ بھی ہو جیسا کہ مین پہلے بھی کہہ چکا ہون ہمارے مظلوم مولوی نے ان سوالون کو بھی چھیڑا ہے، اور اس سلسلہ مین انھون نے جو کچھ لکھا ہے اگر تعبیری سقامت اور بیانی ژولیدگیون سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد لکھنے والون کی طرف سے شاید مشکل ہی سے کچھ اضافہ ہوا ہو، بلکہ تعدد ازدواج کے مسئلہ مین منجملہ دوسری باتون کے اعداد و شمار والے جدید یورپین طریقۂ استدلال کو استعمال

کرتے ہوئے انھون نے جو یہ لکھا ہے کہ

"بحساب مردم شماری ایک ارب چالیس کرور بن گیارہوین حصہ عورتین زیادہ ہین، تو قریب بارہ کرور عورتون کے جو فاضل رہین، اگر مرد کو بشرط عدالت دوسرا نکاح درست نہ ہو تو وہ بیچاری کیا کرین" (ص ۲۱ مقدمہ)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اعداد و شمار کا طلسم قائم کرکے اس سے نتائج پیدا کرنے کا جو شوق یورپ والون پر مسلط ہے، ہمارے اس مظلوم مولوی نے استدلال کے اس جدید طریقہ کو بھانپ بھی لیا تھا، اور اس سے کام لینا بھی شروع کر دیا تھا،

واقعہ تو یہ ہے کہ اس معاملہ مین ان کی بعض چابک دستیان بڑی دلچسپ ہین، ہیرے کے متعلق یورپ کے ارباب سائنس نے یہ مشہور کیا تھا کہ معدن زغال کے گیس سے ہیرا تیار ہوتا ہے، گویا منجمد صاف و شفاف گیس کا نام ہیرا ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے اسی کو بنیاد بنا کر سارے فلکی اجرام کی تخلیق کی جو توجیہ کی ہے، وہ سننے کے قابل ہے، اتنی بات تو لوگون کو معلوم ہے کہ قرآن مین آسمان کا ذکر کرتے ہوئے، فرمایا گیا ہے کہ

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (حٰمٓ سجدہ ۲)

پھر خدا آسمان کی طرف متوجہ ہوا، اور آسمان دھوان (گیس) ہے،

مظلوم مولوی نے اسی قرآنی مقدمہ کو پیش کرکے لکھا ہے

"ظاہر ہے کہ تارون کا مادہ دخان (گیس) ہے، جیسے اس عصر مین (یعنی ہمارے زمانہ مین) ہیرے کا مادہ دخان (گیس) ظاہر ہوا ہے، جو شفاف ہوتا ہے"، (ص ۶۲ مقدمہ)

یہ بھی ان ہی کا دعوی ہے کہ

"آفتاب و ماہتاب ثوابت دخان سے بنائے گئے ہین جیسے ہیرا دخان سے بنتا ہے"،

پھر اس سوال کا جواب یعنی آسمان جب مرتفع گیس، اور دخان ہے، تو قرآن مین سات طبقات مین اسکو جو تقسیم کیا گیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، مظلوم مولوی نے اس سلسلہ مین یورپ ہی کے فلکیون کے ایک نظریہ کو پیش کرکے اس کا جواب دیا ہے، انھون نے لکھا ہے کہ

"حکمت جدید والے چھ درجات اُس کے (یعنی آسمان) کے بہ نظر قلت وکثرت روشنی کے کرتے ہین"

مطلب یہ ہے کہ فضا، کا وہ حصہ جو تارون سے بھرا ہوا ہے، فلکیات کے مغربی حکما، نے یہ دیکھکر کہ بعض حصہ فضا، کا زیادہ روشن ہے، اور بعض مین روشنی کم ہے، الغرض روشنی کی کمی بیشی سے انھون نے چھ درجون مین آسمان کو بانٹا ہے، مظلوم مولوی نے تسلیم کرلیا کہ قرآن کے دخانی آسمان کے چھ طبقات تو یون نکل آئے، باقی ساتوان طبقہ سو اس کے متعلق یہی لکھتے ہین کہ

"نیچے والے میدان کے روشن تارون کو (قرآن مین) آسمان پائین (السماء الدنیا) فرمایا جس کے اندر کارخانہ سورج اور اسکے سیارون کا ہے" (ص ۶۶)

عبارت مین یہان کچھ گنجلک سے رہ گئی ہے، بظاہر اُن کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ چھ طبقات جو روشنی کی کمی و بیشی سے پیدا ہوئے ہین، وہ فضا کے اس حصہ سے الگ ہین جس مین ہمین تارے جگمگاتے نظر آتے ہین، اور سورج اپنے ارد گرد گردش کرنے والے سیارون کے ساتھ اسی مین قائم ہے، گویا آسمان کے متعلق یونانیون کا جو نظریہ تھا کہ ٹھوس قسم کے اجرام ہین، اور ستارے اُن مین جڑے ہوئے ہین، اس کو قرآن کے مخالف قرار دے کر قرآن کے دخانی نظریہ اور فلکیات کے مغربی حکما، کے خیال مین تطبیق کی شکل پیدا کردی گئی ہے اور آسمان کے جرمی وجود کے متعلق ہندوستان کے مدرسون مین جو شور ذیل مغربی خیالات کی وجہ سے بپا ہوا تھا، مظلوم مولوی نے اپنے نزدیک مذکورہ طریقہ سے گویا اسکا فیصلہ کردیا تھا،

اسی سلسلہ مین سال و ماہ کے حساب مین قومون کا مذاق شمسی اور قمری ہونے کے حساب سے جو مختلف ہے، ہمارے مظلوم مولوی کا یہ لطیفہ کافی دلآویز ہے، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عموماً نباتات اپنی نشو و نما مین بھی اور پھلنے پھولنے مین بھی آفتاب کی حرارت کے محتاج ہین، لیکن اسی کے بالمقابل یہ دیکھا جاتا ہے کہ مظلوم مولوی نے لکھا ہے کہ

"نو ماہ قمری مین اس (آدمی) کے حمل کی تعداد اور حیض و نفاس مین ماہ قمری کا حساب ہے"

بظاہر اُن کی غرض یہ ہے کہ انسانی وجود کی پیدائش کا سلسلہ جن قدرتی قوانین کے تحت جاری ہے، یعنی حمل حیض و نفاس وغیرہ، چونکہ بجائے شمسی حساب کے قمری حساب کا تابع ہے، اس لئے وہی لکھتے ہین کہ جن قومون مین،

"انسانیت زیادہ ہے ان کے ہان اب تک حساب قمری کا شمار ہے" (ص ۶۶)

امراض اور وباؤن کے متعلق عموماً قدیم اطبا قائل تھے کہ مادی عفونت یا مادہ کی سڑاندھ کے یہ نتائج ہین، گویا کسی زندہ وجود کی طرف ان بیماریون کو منسوب نہین کیا جاسکتا، لیکن جراثیم کا نظریہ جو انیسوین صدی مین شاید قطعی فیصلہ کی صورت اختیار نہ کرسکا تھا، لیکن ہمارے مظلوم مولوی تک انکی خبر پہنچ گئی تھی، انھون نے جراثیم کے اسی نظریہ کی پشت پناہی مین جن کے عقیدے کی تائید کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"اس وقت مین تحقیقات فرانس سے ظاہر ہوا ہے کہ بہت چھوٹے کیڑے جو سبر بین (خوردبین) سے بمشکل دریافت ہوتے ہین، وہ دل مین گھس کر وبا کے باعث ہوکر باعث ہلاکت انسان ہوتے ہین" (ص ۶۲)

اس سلسلہ مین مظلوم مولوی نے اس قرآنی آیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جس مین فرمایا گیا ہے کہ

ہم نے جن کو نار سموم سے پیدا کیا ہے" ان کا خیال ہے کہ سموم کا لفظ سَم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زہر ہیں، اور یہی زہر ان ہی نادیدہ مخفی ہستیوں میں چھپا رہتا ہے، جنھیں آج کل جراثیم کہتے ہیں، اور بنی آدم کو وہ تکلیف پہنچاتے ہیں، بہرحال بجائے مردہ مادہ کے اتنا تو بہرحال تسلیم ہی کر لیا گیا کہ ان وبائی امراض میں پوشیدہ زندہ ہستیوں کے بکھیڑے کو دخل ہے، مولوی صاحب کا خیال ہے کہ پھر مذہبی روایات میں اگر جنی آسیب کا ذکر آتا ہے، تو لفظی فرق کے سوا واقعہ کی نوعیت میں اب اختلاف ہی کیا باقی رہا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام وہ اسی قسم کے معلومات کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے، ان کے زمانہ میں یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی کہ جزیرۂ جاوا میں ایک ایسا زلزلہ آیا کہ سو میل تک زمین شق ہو گئی، اسی خبر کو بنیاد بنا کر اور یہ کہ جیسے زمین نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے، اسی طرح چاند بھی اسی نظام کا ایک سیارہ ہے، تو شق قمر کے معجزہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں

"کیا بعید ہے کہ سو میل تک جاوہ کی زمین پچھلے دنوں منشق ہو گئی تھی" (ص ۳۲)

ان کے زمانہ میں گنے چنے ہندوستان میں چند اخبار جو نکلتے تھے، عام مولویوں کی روش کے خلاف ان اخباروں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پڑھا کرتے تھے، اپنی کتاب میں اودھ اخبار، سراج الاخبار وغیرہ کا مختلف مقامات میں حوالہ بھی دیا ہے، اور اپنے کام کی چیزیں ان اخباروں سے چن لیا کرتے تھے،

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کی غیر معمولی طوالت پر بحث کرتے ہوئے اور یہ بیان کرتے ہوئے کہ عمریں عموماً جسمانی حالت کی استواری و قوت کی تابع ہوتی تھیں، جس زمانہ میں آدمی کے بڑے پنجے، ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا آج کل کے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے اور زیادہ مضبوط ہوتے تھے، تو عمریں بھی ان کی جسمانی قوت کے مطابق موجودہ عمروں سے زیادہ ہوتی تھیں، پھر اس مقدمہ کے ثبوت میں کہ آج کل کے بہ نسبت پہلے زمانہ کے لوگوں کی جسمانی حالت مختلف تھی، یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"اودھ اخبار ۲۸ جون [illegible] لکھا ہے"

ہمارے مظلوم مولوی نے معلومات کا کافی ذخیرہ اس سلسلہ میں جمع کر دیا ہے، مثلاً یہ کہ ایک دیو کی ہڈی لندن بھیجی گئی ہے، جس میں ایک داڑھ بیس سیر کی ہے، اور اس عہد قیصرۂ ہند (ملکہ وکٹوریہ) میں نہر سرہند کے مابین ایک ندی سے آدمی کی کھوپڑی نکلی ہے، جو ہاتھی کی کھوپڑی کے برابر ہے، اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کی اس خبر کو بھی درج کیا ہے کہ [illegible] ہجری میں سرہند ہی کے قریب ایسی ہڈیاں آدمیوں کی برآمد ہوئیں جن میں ہاتھ کی ہڈیاں تین گز کی تھیں، (ص ۳۰) اسی سلسلہ میں انھوں نے اپنے وطن امروہہ کے متصل قصبہ جس کا نام کانٹھ ہے، اسی کانٹھ کی ایک قبر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"میرے عزیز منشی عبدالرحمن جو بڑے معتمد و ثقہ ہیں"

یہ خبر ان کو سنائی کہ

"قبر برسات میں کھلی دیکھی، جن کی ساق (پنڈلی کی ہڈی) بوسیدہ تین گز کی تھی"

بہرحال ان معلومات کی روشنی میں دعویٰ کیا ہے کہ

"عمریں بقدر قد و قامت تھیں"

اسی طرح شداد والے باغ کے سلسلے میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ ریگستان میں اس قسم کے باغ کے غائب ہو جانے پر تعجب نہ کرنا چاہیے انھوں نے اجمیر شریف کے قریب کچاون نامی قصبہ کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے کہ

"کچاون اجمیر شریف سے پچیس کوس کے فاصلہ پر وہاں کے ایک سیٹھ نے کنواں کھدوایا ہے جس میں ستر پچھتر ہاتھ نیچے کوئلی اور اونٹ کی مینگنی نکلی ہے،" (ص ۹)

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ پڑھتے دیکھتے اور سنتے تھے چاہتے تھے کہ اس سے اسلام اور اسلامیات کی تائید و نصرت کا پہلو پیدا کر لیا جائے، یہ الگ مسئلہ ہے کہ اپنی اس کوشش میں واقعی وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، میں پہلے بھی حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید ان کے اقوال کے متعلق نقل

کرچکا ہون کہ حق و باطل ہر قسم کی باتون کے سامنے "جھک جانے" کا عیب ان مین پایا جاتا تھا لیکن نیت اس مظلوم مولوی کی بہرحال نیک ہی معلوم ہوتی ہے، بلکہ دین کی خدمت کا یہ جذبہ کہا جاسکتا ہے کہ قابلِ رشک ہے، اور اس قابل ہے کہ دوسرون کے لئے عبرت و بصیرت کا سبق بن جائے،

بعض مواقع مین وہ چھوٹی چھوٹی عام اور مشہور باتون سے ایسے نتائج پیدا کرلیتے ہین کہ بے ساختہ اُن کے ذہنی انتقال پر دل داد دینے پر مجبور ہوجاتا ہے، کرۂ زمین کی مشہور پرانی تقسیم جس مین ریاضی کے قاعدے سے زمین کو ہفت اقلیم مین بانٹا جاتا تھا، یورپ والون نے اُس کے مقابلہ مین "ایشیا، یورپ" افریقہ اور امریکہ والی تقسیم کو زیادہ شہرت دے رکھی ہے، اگرچہ بذاتِ خود یہ تقسیم نئی نہین ہے، بلکہ پرانی کتابون مین بھی اس کا ذکر ملتا ہے،

بہرحال کہنا یہ ہے کہ یورپ والون کی مشہور کی ہوئی اسی تقسیم کا تذکرہ کرتے ہوئے "ایشیا" کے لفظ کو وہ "عیشیا" کی صورت مین لکھتے ہین، مطلب اُن کا یہ ہے کہ عیش یعنی زندگی گذارنے کا صحیح مقام چونکہ ایشیا ہی تھا، عموماً معتدل اقالیم جہان آفتاب کی روشنی اور حرارت سے مستفید ہونے کے زیادہ مواقع میسر ہین، اس لئے اصلی نام اس کا "عیشیا" تھا، بعد کو یہی نام ایشیا کے نام سے مشہور ہوگیا ہے، تو ایک لفظی لطیفہ لیکن دلچسپ ضرور ہے،

ان کی کتاب مین اس قسم کے چٹکلون کی کافی تعداد پائی جاتی ہے، ایک موقع پر یہ لکھتے ہوئے کہ

"حیوانون کی غذا نباتات، اور اشجار اور نبات کی غذا جمادات، جمادات کی غذا عناصر، عناصر کی غذا اکسوجن، ہیڈروجن وغیرہ ہین کہ ہر ایک بطور طبعی مناسبت و قربت کے جیسے علم طب

ا؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ مین عناصر اربعہ (آب و آتش و خاک و باد) کو بجائے مرکب کے بسیط جو مانا جاتا تھا، وہ اس کو تسلیم نہین کرتے تھے، اور عناصر کی ترکیب کا جو جدید نظریہ ہے، اسی کے قایل ہوگئے تھے، یہ عجیب بات ہے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فتوحات مین ایک موقع پر لکھا ہے کہ ہوا مین پانی کا لطیف حصہ اگر شریک نہ ہو تو

ظاہر ہے اپنے مین محو کرلیتا ہے،

اور اسی بنیاد پر وہ کہتے ہین کہ

"ان مین سے انسان ہے جس کی غذا طبعی حیوانات طیبات ہین" (مقدمہ صفہ)

یون مسئلہ اکل لحم (گوشت خوری) کو قدرت کا ایک طبعی قرار دینے مین اپنے آپ کو وہ حق بجانب ثابت کرتے ہین،

اُن کے ذہنی انتقال کی ایک دلچسپ مثال شاید وہ بات بھی ہوسکتی ہے، جو آدم و حوا کے قصہ کی تفصیل مین اُن کے قلم سے نکل گئی ہے، ان کا خیال ہے کہ شجرہ جس کے معنی باہم گتھ جانے کے بھی ہین، قرآن مین فیما شجر بینھم کے الفاظ کا مطلب یہی ہے کہ باہمی آویزش والے جھگڑون مین اُن کو چاہئے کہ پیغمبر کو حکم بنائین،

الغرض لفظ الشجرہ کی اس لغوی تشریح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مظلوم مولوی نے دعوی کیا ہے کہ مقاربت اور مجامعت یعنی ہم بستری سے دونون کو منع کیا گیا تھا، روایتون مین الشجرہ کے متعلق جو یہ مختلف باتین آئی ہین، یعنی بعضون مین گیہون اور بعضون مین کہا گیا ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا، ہمارے مظلوم مولوی کا خیال ہے کہ دونون روایتین صحیح ہین اور مطلب یہ تھا کہ

"مرد کی طرف سے مشبہ بہ انگور اور عورت کی طرف سے مشبہ بہ گندم" (ص ۶۹)

استعارے کے رنگ مین اشارہ کیا گیا ہے فبدت لھما سواتھما (پس کھل گئین دونون کی شرمگاہین) کی اطلاع فلما ذاقا الشجر (جب چکھ لیا باہمی آویزش کا مزہ دونون نے) کی خبر کے بعد جو دی گئی ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے ان ہی قرآنی آیتون کو اپنے خیال کا تائیدی قرینہ قرار دیا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۴) ہوا جل اٹھے گی، اُن کے اپنے عربی الفاظ ہین کہ ان الھواء لم یکن فیہ مائیۃ احترق جلد ۲ صفحہ ۵۰۳ فتوحات بظاہر اس سے بھی جدید نظریہ کی تائید ہوتی ہے" ۱۲،

میں نہیں جانتا کہ اہلِ علم کے نزدیک یہ خیال کس حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے،
خود خاکسار کے نزدیک تو قرآن کی ایسی باتیں جن کی تشریح نہ قرآن ہی میں کی گئی ہو اور نہ صحیح حدیث میں ان کا
مطلب بیان کیا گیا ہو، ان کو اجمال ہی کی حالت میں چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے، ورنہ اپنے جی سے
تو گھڑنے والے طرح طرح کی باتیں کہہ سکتے ہیں،[1]

میری غرض تو صرف یہ ہے کہ خواہ بات مانی جائے یا نہ مانی جائے لیکن گندم و انگور والی مختلف
روایتوں میں تطبیق کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے، اگرچہ واقع کے رو سے گندم والی روایت ہو یا انگور والی
دونوں ہی محدثین کی معیار سے گری ہوئی روایتیں ہیں، لیکن ان کا ذہنی انتقال قابلِ تعریف ہے، اور
صرف یہی دکھانا میرا مقصود ہے،

اور یہ قصے تو ان کی علمی جستجو، ذہنی رفتار کی خصوصیتوں کے متعلق تھے لیکن اُن کی علمی زندگی کا
سب سے اہم ترین موضوع جیسا کہ پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں، درحقیقت بائبل کا گہرا مطالعہ اور قرآنی بیانات
کی توضیح و تشریح میں اس سے استفادہ تھا، ہمارے مظلوم مولوی کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ علمائے
اسلام میں جہاں تک خاکسار جانتا ہے اپنے زمانہ کی حد تک شاید وہ اپنی آپ نظیر تھے، براہ راست
تورات و انجیل دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کتابوں کے مطالعہ کرنے والے سلف میں بھی کچھ

---

[1] حضرت آدمؑ کے اسی الشجرہ کے متعلق قرآن ہی میں دوسری جگہ یہ بات ملتی ہے کہ اس کو الخلد کے لفظ کی طرف شیطان
نے منسوب اور مضاف کیا تھا، الخلد کے معنی لغت میں دوام اور ہمیشگی کے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ہی کے سورۂ الہمزہ
میں فرمایا گیا ہے کہ یحسب ان مالہ اخلدہ، (سرمایہ کے متعلق خیال کرتا ہے کہ وہ خلود یعنی دوام و ہمیشگی بخشتا ہے)
یوں بھی عام انسانی فطرت میں مال یا سرمایہ کے متعلق خلود بخشی کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ راسخ ہے، سمجھا جاتا ہے، کہ
سرمایہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے اپنے اسٹیٹس یا حیثیت کو آدمی قائم رکھ سکتا ہے مگر دوسری طرف اسی
کا نتیجہ ہے کہ بجائے خدا کے سرمایہ دار کے دل کا سارا تعلق سرمایہ ہی میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے، اپنی ہر ضرورت میں

لوگ گذرے ہیں لیکن اول سے آخر تک قرآن کا مطالعہ بائبل کو سامنے رکھ کر یا بائبل کا مطالعہ قرآن کو سامنے
رکھ کر میں تو نہیں جانتا کہ ہمارے مظلوم مولوی سے پہلے کسی عالم نے کیا ہو، ان کے بعد اس میں شک نہیں کہ
بعض دوسرے بزرگوں کو بھی اس کی توفیق ہوئی، اور اس کا دعوٰی اگر کوئی کر گذرے کہ اس توفیق کا محرک
نمونہ مظلوم مولوی ہی کا طرزِ عمل بنا ہو، تو مشکل ہی سے اس کی تردید ہو سکتی ہے، بلکہ کافی قرائن ایسے پائے
جاتے ہیں جن سے اس دعوٰی کی گونہ تائید ہی ہوتی ہے، مثلاً "والتین والزیتون" کے قرآنی الفاظ ہی کو دیکھیے
جن کی قسمیں سورۂ والتین میں کھائی گئی ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ انجیر اور مشہور روغنی درخت زیتون کے ساتھ ان
الفاظ کی کتابوں میں جو تفسیر کی جاتی تھی بجائے اس کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے دو مقامات
کا نام ان کو قرار دینا، اس زمانہ کا نیا انکشاف ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے اعلان سے پہلے
بے چارے اسی مظلوم مولوی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"تین و زیتون و طورسینین وبلد امین کے باہم ربط دریافت نہیں ہوتے، اس کو کتب سابقہ
(بائبل) سے دریافت کرنا چاہیے"

پھر اپنا بیان ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ

"کوہ تین پر مسیح علیہ السلام نے مثلھم فی الانجیل کی تفسیر کمال خوبی فرمائی ہے، جیسے
فصل پنجم متی میں مراد اس پہاڑ سے جس پر مسیح حسب فصل مذکور چڑھے"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۶) بجائے خدا کے سرمایہ ہی کے خیال سے تسلی حاصل کرتا ہے، اور آدمی کے بس میں نہیں ہے
آج جو کچھ مل جائے حیوانوں کی طرح اس سے مستفید ہو کر کل کے خیال سے لاپروا ہو جائے، کون کہہ سکتا ہے کہ آج
آدم کی اولاد کے سامنے جو چیز سرمایہ کی شکل میں پیش ہوئی ہے، دوسرے عالم میں وہی کسی نباتی وجود کی شکل میں
پایا جاتا تھا، الغرض اجمال کی تفصیل میں کثرت احتمالات دماغ میں آنے لگتے ہیں، بس احتیاط کا تقاضا ان امور
میں یہی ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کو مجمل حالت میں چھوڑ دیا ہے، ہم بھی اس کو مجمل ہی رہنے دیں،

آگے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہی پہاڑ کوہ تین ہے، وہی لکھتے ہین،

"وہ (یعنی کوہ تین) پندرہ میل بیت المقدس سے ہے" (ص ۴۵)

اسی طرح کوہ زیتون کا بھی پتہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ طور سینین کا تعلق حضرت موسیٰؑ سے اور البلد الارض یعنی مکہ معظمہ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہے،

مین اس وقت یہ نہین کہنا چاہتا ہون کہ کوہ تین یا کوہ زیتون کا جو نشان اور پتہ مظلوم مولوی نے دیا ہے، یہ کس حد تک صحیح ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ بجائے نباتاتی اشیاء کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے مقامات کی تعبیر ان الفاظ کو قرار دینا، اور بائبل کے حوالون سے اس راہ مین استفادہ، یہ آواز پہلی دفعہ ان ہی کی اٹھائی ہوئی ہے،

کچھ بھی ہو قرآن اور بائبل کے تقابلی مطالعہ مین پرانے مذاق کے اس پرانے مولوی نے غیر معمولی جانکاہیون اور جگر کاویون سے کام لیا ہے، قدیم و جدید عہد نامون کی ایک ایک کتاب کا معلوم ہوتا ہے کہ حرف حرف ان کی نظرون سے گذرا ہوا ہے، اور جہان تک ان کے امکان مین تھا، نتائج پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے، ان کے نکالے ہوئے بعض نتیجے تو آدمی کی آنکھین کھول دیتے ہین، یہی جمعہ اتوار، سنیچر کے احترام و تقدیس کا مسئلہ جو مسلمانون، عیسائیون، یہودیون کے دین کا مشہور اختلافی جزیہ ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے یہ تنقیح قائم کرکے کہ کائنات کی آفرینش و تخلیق کے سلسلہ مین "سبت" کا یعنی فراغت کا دن کون سا ہے؟ اصلی سوال یہی ہے، پھر انھون نے یوحنا کی انجیل کی فصل ۱۹ درس ۳۱ کے اس فقرہ کو پیش کرکے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو جس دن سولی دی گئی تھی، وہ سبت کا دن تھا، اور جیسا کہ ان ہی انجیلون مین ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے گرفتار ہونے سے پہلے حواریون سے کہہ دیا تھا کہ،

"فرمست کہ ابن آدم گنہگارون کے ہاتھ مین حوالہ کیا جائے اور مصلوب ہو، اور تیسرے دن

جی اٹھے" (لوقا فصل ۲۴ درس ۷)

یہ اور اس کے سوا انجیلون ہی کے دوسرے بیانون کی روشنی مین ہمارے مظلوم مولوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مسیح علیہ السلام عیسائیون کے عقیدے کے مطابق

"شب سبت، شب شنبہ و شب اتوار قبر مین رہے، اور اتوار کی آخر شب مین قبر سے نکالے گئے، (ص ۱۶۳)

اسی کو پیش کرکے انھون نے لکھا ہے کہ

"اس حساب سے روز سبت روز جمعہ ہوا، (مقدمہ ص ۱۶۳)

واقعہ یہ ہے کہ اتنی کھلی ہوئی واضح بات ہے کہ کم از کم انجیل پر ایمان رکھنے والے عیسائی اس کا انکار نہین کرسکتے کہ سبت کا دن دراصل جمعہ ہی کا دن تھا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک یہودی بھی جمعہ ہی کے دن کو سبت کا دن مانتے تھے، پھر خدا ہی جانتا ہے کہ بجائے جمعہ کے سنیچر کے دن کے احترام پر کس نے اُن کو مجبور کیا، اور عیسائیون کے متعلق تو معلوم ہی ہے کہ رومی بُت پرستون نے دین عیسوی جب قبول کیا، تو اپنے آبائی اور موروثی دین کی چند خصوصیتون کو عیسائی مذہب مین انھون نے شریک کرلیا تھا، جن مین ایک (Sunday) یا یوم الشمس کا یہ دن اتوار بھی ہے، رومی متھرا یا مہر یعنی آفتاب کو پوجتے تھے، اور اسی تعلق سے آفتاب کا یہ دن اُن کے یہان محترم و مقدس سمجھا جاتا تھا[1]،

کچھ بھی ہو، بائبل کے مطالعہ کا والہانہ ذوق اور قرآنی آیات کی بائبل کے مضامین مین سے تشریح و تفسیر کے اس شوق مین جہان بہت سے کارآمد اور مفید نتیجون تک وہ پہونچے ہین، وہین افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مزاولت و ممارست کی کثرت، و شدت کی سہولت سے موجودہ بائبل کے مضامین

---

[1] تفصیل کے لئے منجملہ دوسری کتابون کے خواجہ کمال الدین کی کتاب ینابیع المسیحیت کا مطالعہ کیجئے،

وشتمات کی بے جا وکالت وحمایت مین ان کا قدم اغراق وغلو کے حدود سے بھی جہان تک میرا خیال ہے آگے نکل گیا ہے، یون جب وہ صحو ہوش کی حالت مین رہتے ہین، تو اقرار کرتے ہین کہ

"مین یہ نہین کہتا کہ کتب مذکورہ (یعنی بائبل کے مجموعہ مین جو کتابین شریک ہین) ان مین تحریف وتبدیل نہین ہوئی ہے" (مقدمہ ص ۱۰۴)

"حق" کے ساتھ "باطل" کی تائید وحمایت کی یہی مثالین ہین، اس باب مین ان کا غلو یقیناً ظلم کے حدود تک پہنچا ہوا ہے، اسی سلسلہ مین مین تو حیران ہو کر رہ گیا، جب سینٹ پال جیسی ذات بزرگ کے متعلق پہلی دفعہ اُن کی کتاب مین مدح وستایش کے یہ الفاظ پڑھے، کہ

"پولس مقدس درحقیقت بڑا مجتہد عظیم الشان شخص ہے،

اور یہ کہ وہ

"بڑے زبردست عالم یہودی تھے، ان کا حال یوحنا کا سا ہے کہ پہلے سخت نصاری مسلمانون کے دشمن تھے، پھر ایمان لاکر کیسے کیسے امور نمایان کئے، ویسے ہی پولس یہودی تھے، اور نصاری کے پہلے دشمن تھے، پھر کیسے کیسے امور ان سے نمایان ہوئے"

اور یہ بھی پولوس ہی کے متعلق آپ کی رائے ہے کہ

"ان کے نامہ (خطوط) ہر چند وحی کے طور پر نہین ..... پر بڑے باریک ہین" (ص ۱۶۹)

گو اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف دبے لفظون مین کیا ہے کہ ان کے بزرگ سینٹ پال مجتہد اعظم

"بعض مقام پر خطاء اجتہادی کے خطا بھی کرتے ہین، لیکن متنبہ بھی ہوتے گئے ہین"

سینٹ پال کے واقعی حالات سے جو آگاہ ہین، وہی سمجھ سکتے ہین کہ اس مظلوم مولوی کا یہ کتنا ظالمانہ فیصلہ ہے

سلف، واقعہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی خالص توحید کو تثلیث اور باپ بیٹے کا جھگڑا، نیز کفارہ کا عقیدہ پھیلا کر

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے مطالعہ کے غیر معمولی ذوق کی وجہ سے پادریون سے اُن کا میل جول زیادہ بڑھ گیا تھا، اور شعوری وغیر شعوری طور پر اس قسم کے فکری جراثیم ان ہی کی صحبتون، باہمی مکالمون مین پیدا ہوگئے، وَاللہ اعلم بالصواب،

مین خیال کرتا ہون کہ "مظلوم مولوی" کو اُن کے عیب وہنر دونون قسم کے صفات کے ساتھ روشناس کرانے کے لئے اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے، اپنی علمی جد وجہد تلاش وجستجو کے سلسلہ مین وہ جن جن نتیجون تک پہنچے ہین، اُن کے تفصیلی علم کے لئے مناسب ہوگا کہ اُن کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کا مطالعہ کیا جائے، شاید مین نے پہلے بھی کہین اشارہ کیا ہے کہ اصل تفسیر مین جیسا کہ چاہئے تھا ایسی کوئی خاص چیز نہین ملتی، جو ان کے بلند آہنگ دعوون کا اقتضا ہے، جہان جہان قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح مین بائبل کے حوالون سے مدد مل سکتی تھی، وہان وہ رکے ضرور ہین، لیکن زیادہ تر وہ ایسی باتین ہین کہ اُن سے واقعی ان آیتون کے سمجھنے مین کوئی خاص فائدہ حاصل نہین ہوتا، تاہم کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہین، اور ان اشارون کی مدد سے کوئی آگے بڑھنا چاہے تو شاید بڑھ سکتا ہے،

برخلاف اس کے، اُن کی تفسیر کا مقدمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ بہت سی اہم چیزون کے ساتھ کافی بلند نتائج پر بھی مشتمل ہے، اُن کے خاص طریقہ بیان سے اپنے آپ کو مانوس بنا لینے کے بعد چاہا جائے تو کافی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، خصوصاً قرآن کی آیت :-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۰) مذہب کی ضرورت کو عملاً ختم کر دینا، ختنہ کا قانون جو حضرت مسیح اور حواریون کا موروثی قانون تھا، اور بہیمی ذہنیت کو نقطۂ اعتدال سے قریب رکھنے کی کی تدبیر تھی، اس سے یورپ کی گوشت خوار اور شراب خور قوم کو مستثنیٰ کر دینا، یہ سارے جرائم سینٹ پال ہی کے پیدا کئے ہوئے ہین، ابن حزم نے اپنے ملل ونحل والی کتاب مین براہ راست بعض یہودی علماء کی زبانی یہ دعوی نقل کیا ہے، کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ مین یہود کے جو احبار وعلماء تھے، انھون نے سینٹ پال کو رشوت دے کر آمادہ کیا کہ مصنوعی طور پر عیسائی بن کر مسیح کے دین کو بگاڑ دے،

النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل (اعراف)

النبی الامی جسے وہ یعنی اہل کتاب اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں،

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تورات و انجیل میں جو پیشینگوئیاں درج تھیں، اور کسی نہ کسی شکل میں اب بھی پائی جاتی ہیں، ان کی تحقیق و تفتیش میں کافی محنت اٹھائی ہے، دوسرا مسئلہ یاجوج وماجوج نامی قوموں کا ہے، جن کا ذکر قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں پایا جاتا ہے،

پہلی بات تو ظاہر ہے کہ کسی خاص عہد اور زمانہ سے کوئی خصوصی تعلق نہیں رکھتی، لیکن دوسرا مسئلہ عہد حاضر کے مسلمانوں بلکہ چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عام انسانی نسلوں کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہے، اور آیندہ ہم ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق مظلوم مولوی کے افادات کو پیش کریں گے، (ان شاء اللہ تعالیٰ)

اور یہ بھی ایک حد تک درست ہے، جیسا کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

"بہت سے مقامات پر میں نے بتایا ہے کہ وہاں پر تحریف و تبدیل ہوئی ہے" (مقدمہ ص ۱۰۴)

جس کی ایک مثال وہی یوم السبت والی تحریف بھی ہو سکتی ہے کہ جمعہ دن کو سنیچر اور اتوار سے بدل لیا گیا، وہ اس قسم کی اسرائیلی روایات جو مسلمانوں میں مشہور ہو گئی تھیں، مثلاً عوج بن عنق عملیقی فلسطین کے قریب علاقہ بسن کا جو راجہ تھا، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عوج غیر معمولی ڈیل ڈول والا ضرور تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۱) مسیح خدا کے بیٹے تھے، ان میں لاہوتی عنصر پیوست ہو گیا تھا، ان باتوں کو پھیلائے، احبار یہود نے اس کی ذمہ داری بھی لی تھی کہ جو کچھ گناہ ہوگا اس کا وبال ہم اپنے سروں پر لیں گے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ علماء یہود کی یہ متفقہ روایت ہے، اور بغیر کسی شرم و حیا کے اپنے بزرگوں کی طرف چالبازی کے اس فعل کو منسوب کرتے ہیں، اسلام میں یہودیوں نے رخنہ اندازی اسی راہ سے کی، اور عبد اللہ بن سبا جو ایک یمنی یہودی تھا، اس شخص کے متعلق مسلمانوں میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ کھڑا کیا گیا تھا، اور اس قسم کے فرقے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتے ہیں، یا باطنی عقائد رکھتے ہیں، یا صحابہ کا احترام جن کے دلوں میں نہیں ہے، سب کے سب اسی یہودی فریب کے نتائج ہیں، (الفصل ج ۱ ص ۱۶۳)

لیکن یہ کہ

"سمندر سے مچھلی پکڑ کر سورج سے سینکتا تھا" (ص ۴۴)

مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ اس قسم کی باتوں کا چرچا کر کے اہل عقل کی نگاہوں میں وہ سبک ہوتے ہیں، مولوی صاحب نے پوچھا ہے کہ

"اوپر میں سردی ہوتی ہے یا گرمی؟"

اس کی بھی خبر گپ اڑانے والوں کو نہ تھی،

لیکن بایں ہمہ موجودہ بائبل کے عشق کے نشہ میں جب وہ سرشار ہوتے ہیں، تو ان کے قلم سے سکر کی اس کیفیت میں ایسی باتیں نکل پڑی ہیں جنھیں پڑھ کر بجائے مظلوم کے ظالم قرار پانے کے شاید وہ زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں، اور تو اور بے جا وکالت کے خبط کی یہ آخری حد ہو سکتی ہے کہ حضرت لوط علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کا قصہ جسے قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات میں دہرایا گیا ہے، اور کتاب پیدائش میں بھی یہی قصہ پایا جاتا ہے، لیکن اس اضافہ کے ساتھ کہ العیاذ باللہ حضرت والا کی لڑکیوں نے شراب پلا کر ان سے نسل حاصل کی، وہ داغ جس کے تصور کو برداشت نہیں کر سکتا، خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر برحق پر یہ الزام ایک ایسی کتاب میں کیسے منسوب کر دیا گیا ہے، جسے ماننے والے خدا کی کتاب مانتے تھے، حالانکہ قرآن میں صراحۃً یا کنایۃً کسی قسم کا کوئی ہلکا سا اشارہ بھی اس حد سے زیادہ مکروہ اور گندے بہتان کی طرف نہیں کیا گیا، اس کے بے بنیاد ہونے کے لئے یہی بات کافی تھی، لیکن بے جا پاسداری کے نشہ کا زور دیکھیے کہ ہمارا مظلوم مولوی اس ظالمانہ توجیہ کے پیش کرنے میں کسی قسم کی جھجک نہیں محسوس کرتا، اسی تہمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"در صورت فرض صحت قصہ کے جو سب نسخوں مختلفہ تورات میں پایا جاوے، ہو سکتا ہے کہ شراب ان کے ہاں جائز ہو، اور حالت نشہ میں اجرا کلمہ کفر سے کفر لازم نہیں آتا، جو سخت کبیرہ ہے،"

پس جن کے یہان شراب جائز ہو، ان سے حالتِ نشہ مین جو فعل صادر ہو، نزنانہ ہوا، (ص ۱۰، مقدمہ)

آگے لکھتے ہین :-

"پس اس مین نبی پر قصور عائد نہین ہوتا، قصور کا دار و مدار عقل پر ہے، اور کتاب مین (یعنی توراۃ مین) تصریح ہے کہ لوط نے نہ پہچانا، پس قصور اس مین لڑکیون کا ہے، نہ کہ لوط کا"

حقیقت یہ ہے کہ اس توجیہ کو پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ غلط سی غلط بات اور بد سے بدترین فعل تک کی توجیہ پر آدمی کا منطقی دماغ اگر آمادہ ہو جائے تو کوئی نہ کوئی صورت توجیہ کی نکال ہی لیتا ہے، حالانکہ قصۂ لوط مین التزاماً قرآن اس جزو کو جو حذف کرتا چلا گیا تھا[۵۰]، اسی سے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ آسمانی کتابون کی تصحیح کے لئے آخری ایڈیشن کی شکل مین جو کتاب قدرت کی طرف سے بنی آدم کو ملی ہے اُس نے موجودہ توراۃ کے اس اضافہ کو مسترد کر دیا ہے،

---

۵۰ یہود جو اپنے آپ کو ابناء اللہ (خدا کے بیٹے) واحبارہ (خدا کے دوست) سمجھتے تھے، ان کی نسلی برتری کے زعم کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا، انھون نے بنی اسمٰعیل اپنے چچازاد بھائیون کا نام ہی سارا قین (یعنی سارہ کے غلام) رکھ چھوڑا تھا، سارسین آج تک مسلمانون کو اسی بنیاد پر یورپ مین کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی قرار دیتے تھے، حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، جو نسل حضرت لوطؑ سے پھیلی اس کو بدنام کرنے کے لئے یہ لطیفہ تراشا گیا، اور اسی لطیفہ کو کسی زمانہ مین توراۃ مین شریک کر دیا گیا، ۱۲

اقبال اور ولیم جیمس

از

جناب ڈاکٹر عشرت حسن صاحب انور، ایم اے، پی ایچ ڈی لکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(۶)

ہم پچھلے مقالہ مین لکھ چکے ہین کہ اقبال اور جیمس وارڈ کی طرح کثرت کے معترف ہین، لیکن کثرت کے اقرار سے انسانون کے درمیان ایک قسم کی غیریت اور اجنبیت کا اقرار بھی لازم آتا ہے، اور آپس مین کسی قسم کی ہم آہنگی، ہم خیالی، اور تنظیم کی امید مشکل معلوم ہوتی ہے، عالم مین مختلف افراد (یہ لفظ یہان پر مادی دنیا کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اس کی تفصیل پچھلے مقالہ مین گذر چکی ہے) اگر اپنی اپنی جگہ قطعی وحید اور بے شکل ہین، تو لازمی طور پر ان کو ایک دوسرے سے غیر متعلق اور غیر منسلک تصور کرنا بھی ضروری ہوگا، اور اس صورت مین کائنات مین نظم و ضبط کی کوئی سبیل باقی نہین رہتی اور ایک سخت ترین انتشار اور بے نظمی کا ہونا لازمی ہو جاتا ہے، مگر کائنات مین بہرحال ایک ہم آہنگی، توازن، اور نظم و ضبط موجود ہے میکانک (Mechanics) اور فزکس (Physics) بھی اس کا اقرار کرتے ہین، ان دونون فنون کے اصول سے قانون اسباب (Law of causation) کے بغیر کوئی جزو وقوع پذیر نہین ہو سکتی، اور کائنات کے مختلف

---

۵۱ ولیم جیمس امریکہ کا نامور فلسفی ہے، ۱۹۱۰ء مین اس کا انتقال ہوا، یہ بھی کثرت وجود کا قائل اور ایک معروف دبستان خیال کا بانی ہے، اس اسکول نے پریگ میٹزم (Pragmatism) کے نام سے خوب فروغ پایا،

۵۲ اقبال اور جیمس وارڈ (حصہ دوم) کے عنوان سے معارف بابت اکتوبر مین شائع ہوا ہے،

افراد کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضروری ہے،

اس تعلق کو مختلف اصحاب نے مختلف طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے، مثلاً پچھلے مقالہ میں ہم کہہ آئے ہیں کہ جیمس وارڈ[۵۰] نے اس کو ایک معاشرتی نظام کی تمثیل سے سمجھنے کی سعی کی تھی، اس کا کہنا ہے کہ جس طرح ایک معاشرتی نظام میں مختلف افراد کے ملنے جلنے اور اٹھنے بیٹھنے سے بعض خصوصیات، عادات اور رسوم معرض وجود میں آجاتی ہیں، اسی طرح کائنات میں مختلف افراد کے یکجا ہونے سے کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں جو اس کے نظم و ضبط کے ضامن کہی جاسکتی ہیں، اس تصور سے اگرچہ مذہب اور سائنس دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو مذہب کا حوصلہ کچھ اس سے بھی بڑھکر ہے، اس کے نزدیک عالم کی ہم آہنگی اور اس کا نظم و نسق محض اتفاقیہ نہیں ہے،

جیمس وارڈ نے عالم کے نظم و نسق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے معاشرتی نظام یا فوج کی جو تمثیل پیش کی تھی[۵۱]، وہ یقیناً ایک بہت انوکھا اسلوب اور ایک بہت اہم تجویز تھی، جس کی رو سے انسانی خود مختاری کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے، پھر بھی اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ تنظیم اتفاقیہ ہو، اور اگر ایسا ہی ہے، تو پھر باری تعالیٰ کے وجود کی چنداں گنجائش نہیں رہتی، اور یہ ہم آہنگی اور تنظیم بھی معرض خطر میں معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر افراد عالم[۵۲] قطعی طور پر خود مختار اور آزاد ہوں، تو ان میں بجائے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کے برسرپیکار ہونے کے امکانات زیادہ قوی نظر آتے ہیں،

نیز اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ افراد فطرۃً ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور اپنی اپنی جگہ بالکل وحید و بے مثل ہیں، تو پھر آپس میں ہم آہنگ ہی کیوں ہوں، تو اس کا کوئی تشفی بخش جواب جیمس وارڈ

---

۵۱ اس کے لئے بجائے جیمس وارڈ کے دراصل ہیگل قابل تحسین و تعریف ٹھہرتا ہے، "خارجی روح" کا تصور سب سے پہلے اسی نے پیش کیا تھا، اور اس کے بعد ہی سے کثرت اور وحدت کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش میں سرگرمی کا آغاز ہوا ہے

۵۲ یہ لفظ وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جس میں جمادات نباتات اور حیوانات سب شامل ہیں،

کے یہاں نہیں ملتا، باری تعالیٰ کے وجود کا اگرچہ جیمس وارڈ اقرار کرتا ہے، لیکن اس کی تعریف کی رو سے اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ وجود عجب مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، اولاً اس کا وجود "خارجی روح" یا "خارجی عقل" کے مصداق ٹھہرتا ہے اس طرح بجائے اس کے کہ وہ ہمارا خالق ہو، ہم خود نعوذ باللہ اس کے خالق ثابت ہوتے ہیں، دوسرے چونکہ مختلف افراد کی انفرادیت ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہے، اس لئے وہ خارجی روح جس کو خدا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہمارے متضاد ارادوں، خواہشوں اور حوصلوں کا مرجع قرار پاتی ہے، اس طرح اس کی ذات کو لاتعداد تنازعات، فسادات، اور اختلافات پر مشتمل ماننا ضروری ہوجاتا ہے، تیسرے، ہمارے اور اس کے درمیان ایک ایک طرح کی اجنبیت اور خارجیت باقی رہتی ہے، اجتماعی نظام فکر میں انفرادی طرز فکر کسی طرح منفرد نہیں رہ سکتا، شخصی نظام فکر جس قدر منفرد رہنے کی سعی کرے گا، اور کثرت وجود کو تسلیم کرنے کے بعد اس منفرد طرز فکر کے ذریعہ انفرادیت کو قائم رکھنا اشد ضروری ہے، اسی قدر اجتماعی نظام فکر کے خلاف پڑیگا، جس سے ٹکراؤ لازمی ہوگا، اسی طرح انفرادی فکر کا خارجی عقل سے ہمیشہ اجنبیت اور غیریت محسوس کرنا لازمی ہے[۵۴] اور چونکہ یہی خارجی عقل یا خارجی روح جیمس وارڈ کے نزدیک باری تعالیٰ کے وجود کے مرادف ہے، اس لئے افراد اور باری تعالیٰ کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج باقی رہتی ہے، جیمس وارڈ کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت، غیریت، دوری اور مجبوری برقرار رکھتے ہوئے[۵۵] افراد اور باری تعالیٰ کے درمیان عبد و معبود کا تعلق ثابت کرتا ہے، باری تعالیٰ کا وجود ان کے نزدیک ثابت ہے[۵۶]، مگر یہ وجود ہمارے اور آپ کے سب کے ماوراء ہے، یہی ماورائیت الہیت اور عبدیت کی جان ہے، اسی کے ذریعہ عبد و معبود میں امتیاز اور خالق و مخلوق کے درمیان حاکم و محکوم کا سا رشتہ برقرار رہتا ہے

---

۵۴ خارجی عقل اور انفرادی طرز فکر کے درمیان تنازعہ لازمی نہیں ہے، لیکن اگر انفرادیت پر زور دیا جائے گا، اور جیمس وارڈ نے ایسا ہی کیا ہے تو یہ غیریت ضروری ہے، اسی غیریت سے انفرادیت فروغ پائے گی، ورنہ ختم ہوجائے گی ۵۵ ان کے دلائل پچھلے مقالہ میں گذر چکے ہیں، ۵۶ انگریزی لفظ (Theism) کا مفہوم شاید اس لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ میں اس قدر جامعیت کے ساتھ نہ آسکے،

اقبال اگرچہ جیمس وارڈ کے بہت سے خیالات اور تصورات سے متاثر ہیں لیکن اس مقام پر آکر وہ جیمس وارڈ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، بعض اصحاب نے اقبال کو اُن کی بعض تحریروں کی روشنی میں عبدیت کی طرف زیادہ مائل تصور کیا ہے، یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ اقبال کی بعض تحریروں میں عبدیت کا پہلو بہت نمایاں ہے، اُن کے بعض حالات اور واقعات بھی اس رجحان کی تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ایک روز کوئی درویش اُن کے پاس آیا، اور اُن سے کہا کہو بابا کیا چاہتے ہو، دولت مانگتے ہو، اقبال نے کہا نہیں، اس نے پوچھا عزت چاہتے ہو، اقبال نے کہا نہیں، یہ بھی خدا کے فضل سے میسر ہے، اُس نے کہا شہرت چاہتے ہو، اقبال نے پھر وہی جواب دیا، آخر میں اُس نے کہا کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو، اقبال نے کہا نہیں، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ خدا مجھ سے ملنے آرہا ہے، تو میں میلوں دور بھاگ جاؤں گا، اس لئے کہ جب قطرہ دریا میں مل گیا، تو پھر "قطرہ" کس طرح رہے گا، درویش نے یہ سُن کر سر ہلایا اور کہا کہ بابا تجھ کو جیسا سُنا تھا، ویسا ہی پایا۔[1]

اس حکایت سے اگرچہ اقبال کے رجحانات کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے، لیکن غالباً وہ عبدیت (Theism) کے اس قدر قائل نہیں جس قدر کہ اس حکایت سے ثابت ہوتا ہے، ہماری یہ رائے اگرچہ بہت خطرناک ہے اور مستقل موضوع بحث بن سکتی ہے، مگر اس موقع پر ہم اس کی تفصیل سے قاصر ہیں، انشاء اللہ العزیز کسی حد تک اس مقالہ کے اختتام پر اور وضاحت کے ساتھ اقبال اور رومی کے موازنہ میں اس پر تفصیلی بحث کی جائے گی، البتہ یہاں پر یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اقبال نے جیمس وارڈ کی اُس خلیج کو جو اُس نے خالق و مخلوق کے درمیان قائم کر دی تھی،[2] پھلانگنا چاہا ہے، اور باری تعالیٰ سے میلوں دور بھاگنے کے

[1] یہ حکایت انور بیگ صاحب نے اپنی کتاب شاعرِ مشرق (Poet of the East) میں بیان کی ہے۔ [2] بعض اصحاب شاید ہمارے اس خیال سے پورے طور پر متفق نہ ہوں کہ جیمس وارڈ کے یہاں یہ خلیج کسی قدر نمایاں ہے لیکن ہمارا اپنا عقیدہ یہی ہے اور ہمارے پاس اس کے کافی دلائل ہیں، سب سے سیدھی سادھی بات اس سلسلہ

بجائے اسی کی طرف دوڑنا قبول کر لیا ہے یہ ضرور ہے کہ یہ حوصلہ بہت ڈرتے ڈرتے کیا ہے، اور اُس کا ان کو برابر ڈر لگا رہا کہ کہیں ع فروغِ تجلی بسوزد پرش

اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی برہمن زاد فطرت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ دور بھاگنے کے بجائے ایک نہ ایک دن شمعِ جمالِ دوست پر پروانہ وار رقص کرتے، مگر اس سے بھی اُن کو کچھ زیادہ تسکین و تشفی نہ ہو سکی اور قریب سے قریب تر لذتِ وصل کے حصول کی سعی میں انھوں نے جیمس وارڈ کے ہاتھوں سے اپنا دامن چھڑا کر ایک نئے راہبر کا دامن پکڑ لیا، اس نئے راہبر کا نام ولیم جیمس ہے، جو امریکہ کا مشہور عالم فلسفی ہے، ولیم جیمس کا خیال ہے کہ کثرت وجود کو تسلیم کرنے کے بعد فلسفۂ الٰہیات[1] کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اوّلاً وہ صورت جس میں ہمارے اور خدا کے درمیان ایک گونہ اجنبیت غیریت اور دوئی باقی رہتی ہے جیمس وارڈ کے یہاں جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں یہی صورت بہت نمایاں معلوم ہوتی ہے، اس کے یہاں کثرت وجود اور باری تعالیٰ کے درمیان ایک ایسی خلیج ہے جو کبھی پُر نہیں ہوتی، اور اگر بعض مفسرین اپنے زورِ فکر سے اس کو پُر کرنے کی کوشش کریں تو پھر ہمارے خیال میں کثرتِ وجود کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی، اور جیمس وارڈ کی تمامتر کوشش اسی مقصد کے لئے ہے کہ کثرتِ وجود کو تسلیم کرنے کے باوجود خدا کے وجود کو بھی ثابت کیا جائے اور وہ اپنی اس کوشش میں یقینی طور پر کامیاب ہوا اور کثرتِ وجود کے مقر ہونے کے باوجود اس نے خدا کے وجود کو بھی ثابت کیا ہے البتہ یہ ضرور ہے، کہ اس کوشش میں اس نے خدا کے عقیدہ ہی کو کسی طرح سے الٹ پلٹ دیا ہے، خدا کا جو تصور اس نے پیش کیا ہے، اس سے نہ ہمارے دل ہی کو تسکین ہوتی ہے، اور نہ دماغ ہی کو اطمینان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۸) میں یہ ہے کہ جیمس وارڈ کا خدا ہم سے خارج میں ہے، اور ہمارے وجود کی بناء پر محدود ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے اس کے درمیان ایک خلیج ضروری ہے، [1] فلسفۂ الٰہیات صرف خدا کے وجود سے بحث کرتا ہے، یہ مابعد الطبیعیات کی ایک مخصوص شاخ ہے، مابعد الطبیعیات کسی قدر زیادہ وسیع لفظ ہے، اس میں خدا کے وجود کے علاوہ معاد، جبر و نشر، انسانی خود مختاری وغیرہ کے موضوعات سے بھی بحث کی جاتی ہے

ہو سکتا ہی، مثلاً اُن کے خیال کی رو سے ہمارے اور خدا کے درمیان ہمیشہ دوری اور فراق لازم معلوم ہوتا ہے، خارجی عقل " ہمیشہ خارج ہی میں رہتی ہے، ہماری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب[۱] "کسی طرح نہیں ہونے پاتی، خود جیمس وارڈ اس کا اعتراف کرنے سے گریز کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے، لیکن خارجی عقل کو انفرادی عقل سے قطعی متمیز اور مفروق ماننا ضروری ہے، خارجی عقل کا تصور ہی اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب کہ انفرادی عقل اپنے آپ کو خارج میں کسی دوسرے طرز فکر کا پابند محسوس کرے، اس طرح دونوں میں دوئی کا برقرار رہنا لازم معلوم ہوتا ہے،

لیکن خالق و مخلوق کے درمیان قطعی اجنبیت اور غیریت کا ہونا ہمارے مذہبی رجحانات کے خلاف ہی، ہماری فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم کائنات میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی اور غیر متعلق تصور نہ کریں، ورنہ ہمیشہ پست خیال اور محکوم بن کر زندگی بسر کریں گے، خوف وہراس کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہے گا، اور ہم بجلی، بادل، مینھ، آندھی، طوفان، ہر ایک ارضی اور سماوی حادثہ اور واقعہ سے ہراساں اور خوفزدہ زندگی گذاریں گے، جو انسانی فطرت کے قطعی خلاف ہے، حزن و خوف اور خوف وہراس کا غلبہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ہم اپنے آپ کو کائنات میں بالکل تنہا اور بغیر کسی یار و مددگار کے تصور کریں، لیکن یہ کائنات کسی طرح سے بھی ہماری مخالف اور دشمن نہیں ہے، ہماری اور اس کی فطرت ایک ہے، ہم اور وہ دو غیر متعلق حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ہمارے اور اُس کے درمیان بعض قدر مشترک خصوصیات ہیں، اسی لئے ہم اس کے لئے غیر نہیں ہیں، اور وہ ہمارے واسطے کوئی اجنبی یا مخالف نہیں ہے، ہم دونوں ایک ہی حقیقت سے متعلق ہیں، ایک ہی تصور کے دو رخ ہیں، ایک ہی حقیقت کے حامل ہیں، ان رشتوں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے کسی طرح غیر نہیں ہو سکتے، اس لئے خوف وہراس رکھنے اور اندیشناک رہنے کے بجائے ہماری شایانِ شان یہ ہو کہ یقین محکم کی زندگی گذاریں، یقین کامیاب زندگی کی کنجی ہے، اس کے بغیر انسانی شخصیت کی کسی طرح تکمیل نہیں

---

[۱] نحن اقرب الیہ من حبل الورید،

ہو سکتی، مگر یہ یقین اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب ہمارے اور کائنات کے درمیان کوئی اجنبیت نہ ہو،

کثرتِ وجود کو برقرار رکھتے ہوئے ولیم جیمس کے نزدیک فلسفۂ الٰہیات[۲] کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ افرادِ عالم اور خدا کے درمیان کسی قدر قربت اور نزدیکی محسوس ہو،[۳] فلسفۂ ہمہ اوست میں یہ قربت نہایت درجہ جلوہ نما نظر آتی ہے، لیکن یہ فلسفہ کسی قدر کثرت سے قطع نظر کرکے وحدت وجودی پر زور دیتا ہی، اور کثرت کو لایعنی اور باطل تصور کرتا ہے، یہ صورت بعض لحاظ سے بہت خطرناک ہے، کثرتِ وجود کے انکار سے بہت سی دشواریاں[۴] پیدا ہوتی ہیں، مثلاً عملی زندگی کی تمام سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں، ہم جیمس وارڈ کے سلسلہ میں اوپر کہہ آئے ہیں کہ کثرت وجود ماننے کے بعد ہر فرد میں تکمیل ذات کی کوشش جاری و ساری رہنا ضروری معلوم ہوتا ہے، نیز اصل حقیقت یعنی باری تعالیٰ سے قریب سے قریب تر نسبت حاصل کرنے کا شوق اس کو سرگرم عمل بنائے ہوئے نظر آتا ہے، لیکن اگر ہر فرد عین ذات ہونے کی وجہ سے فی نفسہٖ مکمل متصور ہو جائے، تو پھر سعی عمل محض بیکار رہے،

اقبال جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کثرت کے معترف تھے، اور وحدت الوجودی حضرات کے برعکس کثرتِ وجود کے انکار پر آمادہ نہیں تھے، ان کا خیال ہے کہ کثرت کے انکار سے ذوقِ عمل اور کردار کے اعلیٰ سے اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچنے کا شوق یکسر ختم ہو جاتا ہے، اور کثرتِ وجود ہی کی بنا پر ارتقاء کی تمام حی جاری و ساری ہے، ہر ایک فرد اعلیٰ سے اعلیٰ ترین مراتب اور منازل تک پہنچنے کے جذبہ سے سرشار نظر آتا ہے، اور روایاتی وحدت الوجود کو تسلیم کرنے کے بعد اس تمام ذوق و شوق اور عملی سرگرمیوں

---

[۲] یعنی وہ فلسفہ جو خدا کے وجود کا اقرار کرے، اس کی ایک صورت جس کا ذکر جیمس وارڈ کے سلسلہ میں گذر چکا ہے، یہ ہے کہ خدا کائنات عالم کے ماورا ہے [۳] "عالم کثرت" (A Pluralistic Universe) صفحہ ۲۵، [۴] ہم یہاں صرف انھی دشواریوں کا ذکر کریں گے جن کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے، اور جو اقبال کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں،

پر پانی پھر جاتا ہے، اور کائنات کی ہر شے بحیثیت ایک واحد اور مکمل ذات کا مظہر ہونے کے مکمل اور محمود ماننی پڑتی ہے، اس طرح بُرائی اور نقص کی کوئی گنجایش ہی باقی نہین رہتی، اور دنیا مین جو بُرائیان اور خرابیان قدم قدم پر نظر آتی ہین، اور جن کے دور کرنے کی کوشش مین ہم سب لگے ہوئے ہین، ذاتِ باری کا پرتو قرار پاتی ہین، اور اس کا پرتو ہونے کی حیثیت سے بجائے دنیات کہلانے کے ان کا شمار ملکات مین ہونا لازم ہوتا ہے، اس طرح کوئی بُرائی برائی نہین رہتی، اور بُرائی کو معدوم مان لینے کے بعد اُن کو دور کرنے کی تمام کوشش بھی یکسر ختم ہو جاتی ہے، اور انسانی زندگی ایک جمود، سکوت، خمول ، اور صبر و انتظار کے عالم مین محو ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے،

ان نتائج سے بچنے کے لئے اقبال کے نزدیک کثرت کا اثبات لازمی ہے، چنانچہ جیمس وارڈ کی طرح انھون نے بھی کثرتِ وجود کو لازمی حقیقت تصور کرتے ہوئے آغاز فکر کیا، لیکن جیمس وارڈ کے ساتھ کچھ دور چلنے کے بعد انھون نے بہت جلد محسوس کر لیا، کہ اگر جیمس وارڈ کی طرح کثرت افراد اور خدا کے درمیان ایک خلیج قائم کر دی جائے، تو انسانی شخصیت تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے، اور اس کے بعض مخصوص روحی قلبی اور ذہنی رجحانات کی تکمیل نہیں ہو سکتی مثلاً جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہین، دوئی پر زور دینے سے انسانی شخصیت ذاتِ باری کے قطعی ضد تصور کی جائے گی، اور دونون مین کسی قسم کا کوئی رابطہ اور واسطہ نہ ہونے سے دونون ایک دوسرے سے قطعی غیر متعلق قرار پا جائین گے، لیکن انسان انسانی فطرت کی بنا پر اس کا خواہشمند ہے، کہ دنیوی مشکلات مین اس کا کوئی ہمدرد و مددگار یا دوسرے الفاظ مین کوئی ایسی ذات ہو جو بدرجۂ اتم قوی اور ناصر ہو، اور ہمدردی اور مدد اسی وقت ممکن ہے، جب یہ ذات انسانی مشکلات اور انسانی خواہشات سے پوری طرح واقفیت رکھتی ہو، یعنی سمیع ہو، بصیر ہو، خبیر ہو، تمام حقائق پر محیط ہو، یعنی عالم اور علیم ہو، اور اس کو ذاتِ انسانی سے کچھ ہمدردی اور تعلق بھی ہو، یعنی رحیم ہو، رحمٰن ہو، اور کریم ہو، یہ تمام اوصاف اس بزرگ و برتر ذات اور انسانی افراد کے درمیان اگرچہ ایک قسم کی دوئی

برقرار رکھتے ہوئے نظر آتے ہین لیکن اُن سے کم سے کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہو کہ انسان ذاتِ خداوندی سے اس قدر دور نہیں ہے، جس قدر ہمارے کٹھ ملاؤن نے تصور کر رکھا ہے، اور مذہبی رجحانات کی تسلی بھی اسی وقت پوری طرح ہو سکتی ہے جب کہ ہماری فطرت کو ذاتِ باری تعالیٰ سے قریب سے قریب تر نسبت کا حامل قرار دیا جائے، چنانچہ اقبال اپنے فلسفہ کی تعمیر کے ابتدائی منازل ہی مین کہ اٹھے کہ

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہو تونے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندون سے احتراز کرے (بانگ درا)

اس طریقہ سے ولیم جیمس کی طرح اقبال کے نزدیک بھی انسان کے دل کی یہ ایک بنیادی طلب ہے کہ اس کی فطرت اصل حقیقت سے جس قدر بھی ممکن ہو قریب خیال کی جائے، عینیت اور غیریت کے مسئلہ کی اصل حقیقت یہی ہے، مگر دقیانوسی ہمہ اوست کے قائلین ذوق وصل مین کثرت وجود ہی کا انکار کر بیٹھے اور عینیت کا اقرار کر کے تمام سعی و عمل اور ذوق ارتقاء کے منکر ہو گئے،

اس بنیاد پر ہمہ اوست کا فلسفہ بہت سے نقصانات کا باعث بن گیا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہمہ اوست کا فلسفہ باری تعالیٰ سے انسانی فطرت کی قریب ترین وصل کی ضمانت کی بنا پر انسان کے فطری ذوق و شوق کی بدرجۂ اتم حمایت کرتا ہے، اور انسان اور خدا کے درمیان تمام

---

[1] بعض اصحاب شاید طلب وصل کو فطری مذہبی رجحان تصور نہ کرین۔ بظاہر اقبال خود بھی خالق و مخلوق کے درمیان غیریت قائم رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہین، محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے بھی اس موضوع پر اقبال کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح فرمائی ہے، (رموز اقبال ص ۱۰۰، ۱۰۲) اور اقبال کے یہان اعیان ثابتہ کے نظریہ کی مدد سے خالق و مخلوق کے درمیان ایک مخصوص قسم کی غیریت ثابت کرنے کی سعی کی ہے، مگر غیریت کے دو معنی ہو سکتے ہین، ایک یہ کہ خالق و مخلوق کے درمیان دوئی کا پہلو کسی طرح ختم نہین ہوتا، اس لحاظ سے دونون ایک دوسرے کے غیر ہین، اور فلسفۂ وحدت الوجود اس دوئی کو بالکل ختم کر دیتا ہے، جو اقبال کے نزدیک قطعاً غلط ہے، لیکن دوئی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی خالق و مخلوق کے درمیان سے غیریت دور کی جا سکتی ہے، اس صورت مین مؤخر الذکر غیریت کے معنی

حجابات، نقابات، دوری اور فصل کو یکسر ختم کر دیتا ہے،

اس لئے اقبال کے نزدیک ہمہ اوست کا نظریہ بھی کسی حد تک ایک گہری حقیقت کا آئینہ دار ہے، ہماری فطرت بیشک وصلِ حقیقت کی طالب ہے، اور ہمارا دل اس کا متلاشی ہے کہ ہمارے اور باری تعالیٰ کے درمیان تمام فصل اور دوری ختم ہو جائے، یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن فلسفۂ ہمہ اوست کی بڑی بھول یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے ایک مخصوص رجحان پر زور دیتے ہوئے انسانی ضمیر کی ایک دوسری آواز کو جو اپنے وجود کا اقرار کرتی ہے، یکسر نظر انداز کر دیتا ہے،[1]

انسان کا دل اس بات کا مدعی ہے کہ انسان کا وجود قائم بالذات اور حقیقی ہے، باطل نہیں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) یہ ہیں کہ اگرچہ خالق و مخلوق دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں، پھر بھی دونوں میں ایک مخصوص قسم کا ربط اور تعلق ہے، اور اسی مماثلت ہی کی بنا پر انسان باری تعالیٰ کی صفات سے زیادہ سے زیادہ متصف ہو کر خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ [1] اس سلسلہ میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے جس طرح اقبال کے یہاں کثرت اور وحدت کو تصور کرنے کی کوشش فرمائی ہے (رموز اقبال ص ۱۰۰-۱۰۶) اس سے ہمارے خیال میں اقبال کے رجحانات کی وضاحت کے بجائے خود ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذاتی رجحانات کی توضیح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اقبال کو عبدیت کا حامی ثابت کرنے کی سعی میں اقبال کے ان مخصوص رجحانات کو جو ہمہ اوست کی حمایت میں نظر آتے ہیں یا تو نظر انداز ہی فرما دیا ہے، اور یا اُن کی توجیہ اس طرح فرمائی ہے کہ اس سے اقبال ہمہ اوست کے بجائے عبدیت کے مؤید و حامی ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اقبال ولیم جیمس اور وائٹ ہیڈ سے متاثر ہونے کی وجہ سے کثرتِ وجود کا اقرار صوفیائے کرام کے روایاتی طرزِ کلام مثلاً اعیانِ ثابتہ وغیرہ کے ذریعہ کرنے سے قطعی قاصر ہیں، اعیانِ ثابتہ کے ذریعہ کثرتِ وجود کو تمامتر باری تعالیٰ کے وجود میں منحصر ثابت کرنا یقیناً محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی فلسفۂ اسلام میں ایک قابلِ تحسین کوشش ہے، لیکن اس طرح کثرت معدوم ہو جاتی ہے، یہ خود اقبال کا طرزِ فکر نہیں ہے، بلکہ بعض لحاظ سے اقبال کے طرزِ خیال کے

ہم اقبال اور برگسان کے موازنہ کے سلسلہ میں[1] دیکھ آئے ہیں کہ اقبال نے وجدان کے ذریعہ ذاتِ نفس کا اثبات کس قدر پُر زور طور پر کیا ہے، ہم اپنے وجود سے کسی طرح انکار نہیں کر سکتے، اب ہمارے ضمیر کے ان متضاد دعاوی اور رجحانات کو کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا جائے، اس کوشش میں اقبال ولیم جیمس کے ساتھ کچھ دور چل کر وائٹ ہیڈ[2] (White head) اور دوسروں سے متعلق ہو جاتے ہیں،

ولیم جیمس نے کثرت اور وحدت کی گتھی کو ہمارے ذاتی شعور کی تمثیل سے سلجھانے کی کوشش کی ہے، اس کا کہنا ہے کہ ایک شعوری حالت بہت سی دوسری شعوری و نیم شعوری کیفیات پر مشتمل ہے، برگسان کی رہنمائی قبول کرتے ہوئے[3] ولیم جیمس بھی اس بات کا مدعی ہے کہ وجدانِ ذات ہی میں یہ سوال حل ہو جاتا ہے، کہ ہماری اپنی ذات کس طرح بیک وقت کثرت اور وحدت کی حامل ہے، ہم اقبال اور برگسان کے موازنہ میں دیکھ چکے ہیں کہ برگسان کے نزدیک وجدانِ ذات ہی کے ذریعہ ہم کو یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ہماری ذات کثرتِ حالات کی حامل ہے ہماری ذہنی، فکری اور احساس و شعور کی ہر حالت خود کوئی قائم و دائم، اور جامد و ساکن نہیں ہے، بلکہ مستقل طور پر بدل رہی ہے، اور یہ تقلب اور تبدل اس قدر سریع اور ہموار ہے کہ بقول برگسان کے کوئی حالت بھی حالت کہلائی جانے کی مستحق نہیں ہے، ہاں اکثر اوقات ہم اپنے بعض مخصوص

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۴) قطعی منافی ہے، چونکہ اقبال خیال آرائی اور منطقیانہ تصورات کے برعکس وجدانِ ذاتی تجربہ اور کثرتِ وجود کے حامی ہیں، اس لئے اُن کے فلسفہ میں اعیانِ ثابتہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، اگر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب اقبال کو برگسان، ولیم جیمس اور وائٹ ہیڈ سے متاثر تسلیم کرتے، تو شاید اعیانِ ثابتہ کے ذریعہ کثرت اور وحدت کی گتھی کو سلجھانے کی سعی نہ فرماتے، یہ نکتہ کسی حد تک اسی مقالہ میں اور بہت حد تک اقبال اور وائٹ ہیڈ کے موازنہ میں پوری طرح واضح ہو جائے گا [1] اقبال اور برگسان معارف بابت مئی ۵۱ء [2] انشاء اللہ العزیز یہ اگلے مقالہ کا موضوع ہوگا، [3] ولیم جیمس برگسان سے بہت متاثر ہے، وہ اکثر و بیشتر اس کی مبالغہ آمیز تعریف کرتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے کہ برگسان کا طرزِ فکر معجزات کا حامل ہے، اور وہ فلسفی یقیناً حیرت انگیز جادوگر ہے"

رجحانات اور مقاصد کے تحت کسی ایک کیفیت پر نظر جما کر اس کو دیگر متعلقہ کیفیات اور حالات سے غیر متعلق سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اس غلط بینی کی وجہ سے اس کو جامد، ساکت، غیر متحرک اور غیر متغیر تصور کرنے لگتے ہیں، ورنہ دراصل نہ کوئی حالت مستقل حالت ہے، اور نہ کوئی گذری ہوئی (جو حقیقت میں گذری ہوئی نہیں ہے) یا آنے والی کیفیت دوسری کیفیات سے غیر متعلق ہوتی ہے، بلکہ ہر ایک کیفیت ہر دوسری کیفیت میں سرایت کئے ہوئے نظر آتی ہے، اس طرح ذاتِ نفس بیک وقت وحدت اور کثرت دونوں کا مرجع ثابت ہوتی ہے،

ولیم جیمس ذاتِ نفس کے وجدان ہی کی بنا پر یہ تجویز پیش کرتا ہے، کہ اگر ہمارا وجود ایک سلسلۂ احساسات، کیفیات، اور ادراکات کا حامل ہے، تو اس سلسلۂ شعور کو ازلی اور لامتناہی تصور کرنا ضروری ہے، اور اس لامتناہی سلسلۂ شعور کو باری تعالیٰ کی ذات سے کسی طرح خارج تصور نہیں کیا جا سکتا[۵۵]، جس طرح ہماری اپنی ذات میں مختلف شعوری کیفیات ایک دوسرے سے متعلق ہیں، اسی طرح ہماری آپ کی سب کی شعوری، نیم شعوری، اور غیر شعوری کیفیات، اور ہم سب کے طرح طرح کے احساسات، ادراکات اور تجربات ذاتِ باری میں ممزوج و مربوط، اور اسی سے منسلک ہیں،

اقبال ولیم جیمس کے مذکورہ بالا خیالات سے پورے طور پر متفق ہیں، مثلاً

۱- ولیم جیمس کی طرح خالق و مخلوق کے درمیان سے دوری اور مہجوری ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں،

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے — بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۵) متعدد جگہ پر اس قسم کی تعریفیں آئی ہیں، دیکھئے "عالم کثرت" (A Pluralistic Universe - ص ۲۲)، [۵۴] معارف بابت مئی ۱۹۵۱ء،

[۵۵] برگسان کے یہاں جیسا کہ ہم برگسان اور اقبال کے موازنہ میں کہہ آئے ہیں، "اصول حیات" (Élan Vital) ہی اصل حقیقت ہے اور کسی بالاتر حقیقت سے متعلق نہیں ہے اس لئے ان کے یہاں خدا کے وجود کی چنداں گنجائش نہیں ہے،

۲- ولیم جیمس ہی کی طرح ہمہ اوست کی تائید کرتے اور عین حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قربت اور وصل ڈھونڈتے ہوئے لکھتے ہیں،

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

(بانگِ درا)

چمک پائی ہے تاروں نے جہاں سے — دہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے 〃
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے — تاریکی میں وہ قمر میں وہ جلوہ گرِ سحر میں 〃
کہتے ہیں بیقرار ہے جلوۂ عام کے لئے — حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں 〃
کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ وحدت سے تو جو چھیڑے، 〃
یقین ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا،
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں — چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں 〃
بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں — ایستادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے 〃

۳- پھر ولیم جیمس ہی کی طرح اس خیال کے حامی ہیں کہ کثرت اور وحدت کی گتھی ذاتِ نفس کے وجدان کی بنا پر ہی کھل سکتی ہے، اور ذاتِ نفس کی تمثیل ہی کے ذریعہ کثرتِ افراد کے اس تعلق کو جو کہ ذاتِ باری سے ہے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً کہتے ہیں،

این گنبدِ مینائی این پستی و بالائی — در شد بہ دلِ عاشق با این ہمہ پہنائی
اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن — یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی

(پیامِ مشرق)

راہ کو راست بخود غوطہ زن اے سالک | جادہ راگم نکند در تہ دریا ماہی (پیام مشرق)

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد | یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی

۴۔ اس خیال میں بھی اقبال ولیم جیمس سے متفق ہیں کہ کثرت وجود باری تعالیٰ کے وجود سے کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے، لیکن ذاتِ باری قریب ترین ہو کر بھی ہم سے علحدہ ہے، مثلاً

وصالِ ما وصال اندر فراق است | کشود این گرہ غیر از نظر نیست

گہر گم گشتۂ آغوش دریاست | ولیکن آب بحر آب گہر نیست

خدا کو ہم اپنے ذات کے وجدان کی بنا پر پوری طرح تصور کر سکتے ہیں، اور اسی وجدان کی تمثیل کے ذریعہ ہم اپنے آپ کو ذاتِ باری سے ایک مخصوص طور پر متعلق بھی خیال کر سکتے ہیں، ہمارا اور باری تعالیٰ کا تعلق دو قطعی غیر متعلق ہستیوں کا سا تعلق نہیں ہے، بلکہ ہمارا وجود اسکی ذات سے بہت ہی قریبی نسبت اور بہت ہی گہرا تعلق رکھتا ہے، ایک نقطۂ نظر سے وحدت ذات ہی کثرت کی حامل ہے اور دوسرے زاویۂ نظر سے کثرت وجود ہی وحدت ذات باری سے اس طرح متعلق ہے کہ اس کے بغیر وحدت ذات کا ادراک ہی نہیں کیا جا سکتا، یہ کثرت بعض صوفیاے کرام کے خیال کے برعکس محض اعتباری نہیں ہے، اُس کی اقبال کے یہاں کوئی گنجایش ہی نہیں ہے، چونکہ کثرت کو تسلیم کئے بغیر جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں اخلاق اور بعض لحاظ سے خود حیاتِ انسانی کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں، اس لئے بعض صوفیاے کرام نے یہ تو محسوس کر لیا کہ کثرت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن وحدت کے ساتھ ساتھ کثرت کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش میں بعض صوفیہ اس قدر کامیاب نہ ہو سکے، جس قدر کہ حیات انسانی کو فروغ دینے، اور اس کو ارتقا کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات تک لیجانے کے لئے ضروری تھا، ان میں سے بعض حضرات مثلاً جامی رحمۃ اللہ علیہ یا محمود شبستری[1] وغیرہ نے کثرت کی اعیان ثابتہ کے ذریعہ توجیہ فرمائی ہے،

[1] ان کا نام خاص طور پر اس لئے لیا گیا کہ اقبال نے اُن کی مثنوی گلشن راز کے جواب میں "گلشن راز جدید" تصنیف

اقبال کو بھی اسی طرز فکر کا حامی خیال فرماتے ہوئے محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"اقبال کا اذعان ہے کہ اشیاء تمام معلومات حق ہیں، تصورات الٰہی ہیں، علیم صور علمیہ مطلق ہیں جب ذوات معلومات حق ہیں، تصورات الٰہی ہیں اور ذاتِ حق یا علم مطلق میں ثابت ہیں، اور ذات حق بالذات موجود ہے، اور تمام صفات وجودیہ اور افعال ذاتیہ سے موصوف ہے، تو ظاہر ہے کہ ان دونوں میں مغایرت تامہ پائی جاتی ہے[1]"

ہم محترم ڈاکٹر صاحب کے اس خیال کی تائید کرنے سے قطعی قاصر ہیں، ہمارے خیال میں اگر اقبال بھی حضرت جامیؒ یا محمود شبستریؒ کے طرز فکر کے حامی ہوتے تو "گلشن راز جدید" ہرگز نہ لکھتے[2]، جیسا کہ ہم اس سے قبل کہہ آئے ہیں، اور خود ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب بھی تسلیم فرمائیں گے کہ اقبال تعقل اور تفکر کے خلاف ہونے کی بنا پر وجدان کے پرزور حامی تھے، اس لئے اس تصور اور تعقل کو جسے اقبال نے اپنے لئے پسند نہیں کیا، باری تعالیٰ کی ذات سے کس طرح منسوب کیا جا سکتا ہے، اور اعیان ثابتہ بغیر تعقل اور تفکر کے معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتے، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کثرت کو اعیان ثابتہ کے مترادف مان لینے کے بعد کائنات میں مزید تخلیق، ترقی اور ارتقا کی کوئی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی اس لئے اقبال ترقی اور ارتقا کے پرزور حامی ہونے کی بنا پر اس خیال کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتے کہ تمام افراد صور علمیہ الٰہی ہیں — نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر وجدان ہی انکشاف حقیقت کا معتبر ذریعہ ہے (اور صوفیہ نے اس خیال کی پرزور حمایت کی ہے) تو کیا وجدان سے یہ انکشاف ہو سکتا ہے کہ ہم ذاتِ باری کے صور علمیہ ہیں، وجدان سے ذاتِ باری کا ادراک اس سے جو تعلق ہماری ذات کو ہے، اس کا انکشاف

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۸) کی ہے، جس میں یہ کوشش بہت نمایاں ہے کہ صوفیاے کرام کے روایاتی طرز فکر سے ہٹ کر وحدت اور کثرت کے تعلق کو کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے، [1] رموز اقبال (ص ۲۶) [2] اقبال اور محمود شبستری میں جو اختلافات ہیں اس کو بھی ہم انشاء اللہ العزیز آگے چل کر پیش کریں گے،

ہوتا ہے، یہ نہین کہا جا سکتا کہ وجدان سے ہم کو اپنے صور علیہ الٰہی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے چونکہ ذاتِ باری کے مشاہدہ کے معنی کسی طرح یہ نہین ہو سکتے کہ ذاتِ باری کے تصورات کا بھی مشاہدہ میسر ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بخوبی واضح ہے کہ اقبال فلسفۂ ہمہ اوست کے مخالف ہونیکے بجائے ولیم جیمس کی رہنمائی مین بہت حد تک اس کے حامی اور معتقد ہین، ہان یہ ضرور ہے کہ اُن کا ہمہ اوست کا نظریہ بعض صوفیا کے روایاتی ہمہ اوست کے عقیدہ سے کسی قدر مختلف ہے، اور اس بنا پر اس کو ہمہ اوست کے لفظ سے تعبیر کرنا خود ایک بڑی غلطی ہے لیکن پھر ہم کس لفظ سے اس کی صحیح تعبیر کر سکتے ہین، یہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا، سردست یہ بات قابلِ توجہ ہو کہ ہمہ اوست کا یہ دعویٰ ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات ہر شئے پر محیط ہونے کی بنا پر اصل حقیقت ہو، اس سے دو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہین،

اول یہ کہ چونکہ باری تعالیٰ کی ذات ہر شئے پر محیط ہونے کی بنا پر اصل حقیقت ہے اس لئے کائنات غیر حقیقی ہے، چنانچہ بعض صوفیاے کرام نے یہی نتیجہ اخذ کیا، اور کائنات عالم کو غیر حقیقی تصور کیا اور جب غیر حقیقی ہونیکے مفہوم پر غور کیا گیا تو اس کو ایک دھوکہ، ایک فریب، ایک خواب، ایک اعتبار ذہنی خیال کیا گیا، لیکن چونکہ باری تعالیٰ کے علاوہ سب افراد بے حقیقت ہین، اس لئے کائنات انسان کے ذہن کی تعمیر نہین تصور کیجا سکتی، چنانچہ اُس کو باری تعالیٰ کے تصورات اور اعیان ثابتہ کا درجہ دیدیا گیا،

دوسرے یہ کہ چونکہ باری تعالیٰ کی ذات ہر شئے پر محیط ہونیکی بنا پر اصل حقیقت ہو اسلئے کائنات غیر حقیقی نہین ہو، یہ نتیجہ اقبال نے اخذ کیا، اور اس تجویز مین وائٹ ہیڈ اور رومی کے اثرات بنہایت نمایان ہین، ان کو انشاء اللہ العزیز آگے چل کر علی الترتیب واضح کیا جائے گا،[1]

(باقی)

---

[1] ہماری تحقیقات کی آخری منزلین اب قریب آچلی ہین، شاید ان دو مقالون کے بعد اقبال کے فلسفہ کی ایک مکمل تصویر ترتیب پا سکے،

قوۃ ایمانیہ وظہور غیب

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ

چشم بگذشتہ از ین محسوسہا یافتہ از غیب بینی بوسہا

خود نمی یابم یکے گوشے کہ من نکتۂ گویم از ان چشم حسن (رومیؒ)

"نہ تو ہم اس خیال مین رہتے ہین کہ ہمین "صداقت" کا علم ہے لیکن یہ ہماری سمجھ مین نہین آتا کہ کیون صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی مین نمایان نہین ہوتے جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فی القضاء امورِ تکوینی مین کامیابی و کامرانی، نزول الشہداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی جیسی کہ شہیدون کی جنت مین ہوگی، عیش السعداء، سعیدون کا سا عیش، النصر علی الاعداء، دشمنون پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہو؟ کیون رحمت کے وہ آثار ظاہر نہین ہوتے جن سے ہمارے دل کو ہدایت ہو، (تھدی بھا قلبی) ہمارے کامون مین جمعیت ہو (تجمع بھا امری) ہماری ابتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیان سلجھ جائین (تلم بھا شعثی) ہمارا دین سنور جائے (تصلح بھا دینی) ہمارا قرض ادا ہو جائے (تقضی بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزون کی نگہبانی ہو، (تحفظ بھا غائبی) ہمارے پیش نظر چیزون کو بلندی عطا ہو، (ترفع بھا شاھدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے، (تبیض بھا وجھی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، (تزکی بھا عملی) رشد و ہدایت کا ہمارے قلب مین الہام ہو (تلھمنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذباتِ الفت از سر نو پیدا ہو جائین، (ترد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہین، (تعصمنی بھا من کل سوء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقین صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمین حاصل نہین جو ہمارے دل مین پیوست ہوگیا ہو، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ مین کی گئی ہی،

اللّٰھُمَّ انی اسئلک ایمانا یباشر قلبی	اے اللہ مین تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہون جو
و یقینا صادقا، الخ	میرے دل مین پیوست ہو جائے، اور پختہ یقین الخ

ہمین علم و یقین کی وہ کیفیت حاصل نہین، جس کے پیدا ہوجانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ مین حریت تامہ حاصل ہو جاتی ہے!

ہم مین سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش مین اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہین، جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمین ایمان کے ان آثار و برکات سے مالامال کردے، جن کا اوپر ذکر ہوا، ہمین ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہمارے قلوب مین پیوست کردے، وہ پختہ یقین عطا کرے، جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہی، اور جس کے حاصل ہوجانے کے بعد ہماری ساری پریشانیان سلجھ جائین، ہمارا چہرہ نورانی ہوجائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہوجائے، اور تمام امور مین کامرانی و کامیابی نصیب ہو!

یقینا ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر تو اس کو جانکر بھی اس پر عمل کرنا نہین چاہتے، بعض کا تو یہ عقیدہ ہی کہ زندگی مین پریشانیون سے نجات اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہی، ان کا خیال ہی کہ

آدم از کثرتِ پریشانی	می کند جستجوے جمعیت
آدم آمد سہ حرف وہر سہ جدا	نشود جمع تا درم میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہی، لیکن وہ ایک راز نہفتہ ہے، اس تک اُن کی رسائی ممکن نہین، وہ راز سینہ ہے، سفینہ پر نہین ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کالمعدوم ہین، بعض سمجھتے ہین کہ یہ طریقہ نہت مشکل ہی، اس پر عمل ناممکن ہے، یہ ہر شخص کے بس کی چیز نہین، الفاظ یا تعبیرات کی کثرت نے

اس کو چھپا رکھا ہے، اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہی،

از دلائل می شود مشکل بما ادراکِ حق!!
این رہ از بسیاری سنگِ نشان ہموار نیست!

حقیقت یہ ہی کہ یہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہین، بڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہین،!! الہامی صداقتون کے سمجھنے کے لئے ہمین بچون کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہئے، اسی وقت ہم مین وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمین کامل حریت نصیب ہوتی ہے،!

یہ طریقہ مختصر الفاظ مین یہ ہی،-

۱- ہمین حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتون اور عنایتون کو یاد کرنا چاہئے، جو ہماری پچھلی زندگی مین ہم پر کی گئین، اور اُن پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے،

۲- ہمین حق تعالیٰ کی ان آیندہ نعمتون اور عنایتون کا شکر ادا کرنا چاہئے، جن کا ابھی ظہور نہین ہوا ہے،!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے:

۱- ایمان ان اشیاء کا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے امید رکھتے ہین، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہی، جن کا ابھی ظہور نہین ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حُسن ظن، اُن سے اُنس و محبت مومن کا طرۂ امتیاز ہی، الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ اس ایمان، حُسن ظن، انس و محبت ہی سے وہ تمام نعمتین جو ابھی پردۂ غیب مین ہین، خارج مین ظاہر ہوتی ہین، یہ وہ پل ہین، جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتین مومن تک پہنچتی ہین، اس راز کو عارف رومی نے یون فاش کیا ہی،:-

آن کہ شد انسش بشاہ فرد خویش
یافت در ما نہاے جملہ درد خویش

ایمان دانش مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں، راحتوں، عنایتوں اور احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں ہم اس احساس کو تازہ کرکے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کرکے چیخ اٹھتے ہیں۔

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد — احسان ترا شمار نتوانم کرد
گر بر تنِ من زبان شود ہر موی — یک شکرِ تو از ہزار نتوانم کرد

(ابوسعید مہنہ رح)

بجائے پچھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے ہمیں یاد کرنا چاہیئے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پچھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض والم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیئے جن میں حق و تعالیٰ کی کارسازی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی بے پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شر کی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا، لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، اُن کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجا لب ہمدنت و شکر ابر نیسان ست!
کہ از شمار بردن قطرہ ہای باران ست! (حافظ)

ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا! لاحول ولا قوۃ الا باللہ! جب ہم شکست خوردہ و دل سوختہ تھے، اُن کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی! جب ہم برگشتہ و پریشان تھے، اُن کی رحمت نے ہمیں راہ دکھلائی، جب ہم غلط راہ پر پڑلیے تھے، اُن کی حکمت نے راست کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن میں مبتلا تھے، ان کے

فضل عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا قربانِ احسانت شوم — این چہ احسان است قربانت شوم!

اللھم لک الحمد کما ینبغی لجلال وجھک وعظیم سلطانک!

ہر روز کچھ دیر کے لئے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہئے جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لئے نجات کا سامان فراہم کیا، ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کرسکتے ہیں، ہمیں انھیں یاد کرنا چاہیئے اُن پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے، عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!

عارف آن باشد کہ باشد حق شناس
ہر کہ عارف نیست گردد ناسپاس (عطار)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے:-

اللھم لک الحمد بما ھدیتنا	تیرے ہی لئے حمد ہے اس پر کہ تونے ہمیں ہدایت
ولک الحمد بما اکرمتنا و لک	دی، اور تیرے ہی لئے حمد ہے اس پر کہ تونے
الحمد بما سترتنا! ولک الحمد	ہمیں عزت دی اور تیرے ہی لئے حمد ہے کہ تونے
بالقرآن و لک الحمد بالاھل	ہماری پردہ پوشی کی، اور تیرے ہی لئے حمد ہے
والمال و لک الحمد بالمعافاۃ	قرآن پر، اور تیرے ہی لئے حمد ہے اہل و مال کے
ولک الحمد حتی ترضی ولک	اور تیرے ہی لئے حمد ہے درگذر کرنے پر، اور تیرے
الحمد اذا رضیت یا اھل التقوی	ہی لئے حمد ہے، یہاں تک کہ تو خوش ہوجائے
واھل المغفرۃ!	اور تیرے ہی لئے حمد ہے جب کہ تو خوش ہوجائے
	اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہیے (ڈرنے کے

[illegible]

ان ہی انعامات پر جو ہماری پچھلی زندگی مین حق تعالیٰ نے، ہم پر کئے ہین، ہمین حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے،

نحمد اللہ خالق الاشیاء نشکر اللہ رازق الاحیاء (مغفر الحق)

یاد رکھو کہ ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے، اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہین کہ حق تعالیٰ ہر حال مین ہمارے لئے کافی ہین، ہمارے قلب کی گہرائیون سے یہ چیخ نکلتی ہے،

اللہ الکافی، کافی، قصدت الکافی وجدت الکافی لکل کافی

کفانی الکافی ونعم الکافی وللہ الحمد

ہمارا خوف دور ہو جاتا ہے، امیدین جاگ اٹھتی ہین، نور یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے، اور ہم حق تعالیٰ کے قرب ومحبت کی روشنی مین داخل ہو جاتے ہین، اور ہمین وہ شاندار آزادی حاصل ہوتی ہے جو مقربین بارگاہِ الٰہی کا حصہ ہے، وہ فرحت وسرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء سے تعبیر کیا گیا ہے! اور اسی سرور کی حالت مین ہم بیدل کی زبان مین گنگنانے لگتے ہین،

تا مزرعِ سبز آسمان خواہد بود تا خرمی باغِ جہان خواہد بود
ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود شکرِ کرمِ ترا زبان خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گذشتہ احسانات کا حمد وشکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے، جس کو ہر زمانہ کے صلحاء وصدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے ازدیاد کے لئے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس حد تک کیا ہے کہ ان سے عجیب وغریب کرامات وخوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الٰہیہ کے دروازون کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو ان سے قریب، اس کی وجہ سے ان کے لئے ایسی چیزین ممکن ہو گئی تھین، جو عام طور پر انسان کے لئے ممکن نہین ہوتین، دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنوین مین دو شیرون کے ساتھ قید

کر دیا تھا، تو انھون نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی تھی:

الحمد للہ الذی لا یخیب من دعاہ والحمد للہ الذی لا یکل من توکل علیہ، الحمد للہ الذی ہو ثقتنا حین تنقطع عنا الحیل الحمد للہ الذی ہو رجائنا حین یسوء ظننا باعمالنا الحمد للہ الذی یکشف ضرنا عند کربنا، الحمد للہ الذی یجزی بالاحسان احسانا، الحمد للہ الذی یجزی بالصبر نجاتا،

(رواہ ابن ابی الدنیا بسند حسن)

حمد اس خدا کی ہے جو اپنے مانگنے والے کو محروم نہین کرتا، حمد اس خدا کی ہے، جو اس شخص سے نہین تھکتا جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہے، جو ہمارا آسرا ہے جب ہماری تدبیرین منقطع ہو جاتی ہین، حمد اس خدا کی ہے جو ہماری امید ہے جب ہمارے قلب ہماری اعمال کی وجہ سے سیاہ ہو جاتے ہین، حمد اس خدا کی ہے جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دور کرتا ہے، حمد اس خدا کی ہے، جو احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے حمد اس خدا کی ہے، جو صبر کا بدلہ نجات ورستگاری سے دیتا ہے،

یہ ساری دعا حق تعالیٰ کی حمد وثنا سے بھری ہوئی ہے، اس کا ہر جملہ ان تجربون کو حافظہ مین تازہ کرتا ہے، جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہمین ہوئی تھی، اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی، اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے،

اللّٰھم ولک الحمد شکراً ولک المن فضلاً انت ربنا حقا ونحن عبیدک رقا،

اے اللہ تیرے ہی لئے ہر تعریف ہے، شکر کے ساتھ اور تیرا ہی حصہ ہے فضل وکرم کے ساتھ بیشک تو ہمارا رب ہے، بالیقین اور ہم تیرے بندے ہین، ناتوان ومحتاج،

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی لڑائی کے لئے نکلے، تو اُن کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد وثنا ہی جاری تھی:

کنت وتکون وانت حیّ لا تموت	تو ہے اور رہے گا، اور ایسا زندہ ہے جس کو
تنام العیون وتکدر النجوم وانت حیّ	موت نہیں! آنکھیں سوتی ہیں، اور ستارے
قیوم لا تاخذک سنۃ ولا نوم	بدلتے ہیں، تو زندہ اور زندہ رکھنے والا
یا حیّ یا قیوم!	ہے! تجھ کو اونگھ اور نیند نہیں چھو سکتی!!

حیّ یا قیوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری پچھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی ہے، وہ اب بھی ہم پر محیط ہے، وہی قوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضل عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے!

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و مبرا ہیں، یہ امر واقعی کہ انہوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلا و غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم تغیر کی وجہ سے ہمیں ہرگز فراموش نہ کریں گے!

سعدی اسی طریقہ کو جو ہم بیان پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گذشتہ احسانات کو یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

فراموشت نہ کرد ایزد در آن حال	کہ بودی نطفہ مدفون و مدہوش!
روانت داد و عقل و طبع و ادراک	جمال و حسن و رائے و فکرت و ہوش!
دہ انگشت مرتب کرد بر کف	دو بازویت مرتب ساخت بر دوش!
کنون پنداری اے ناچیز ہمت	کہ خواہد کردنت روزے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی تعقل بنی رہتی ہے، ہماری مدد کرنے سے قاصر ہوتی ہے! لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے، وہ ایک جمہ توان قوت بن جاتی ہے! اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو جب ہم یہ یاد کرتے ہیں، کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کئے ہیں، تو ہم اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے، وہ اب بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق تعالیٰ کے ہاتھ کمزور نہیں ہوگئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں، اور ہمیں بچا نہ سکیں، اور نہ ہی معاذ اللہ وہ بہرے ہیں کہ سن نہ سکیں! وہ سمیع و بصیر ہیں، وہ علیم و قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ؟! کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا!

اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے ہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں، اُن کے جملہ احسانات کا، جملہ عنایتوں و کرموں کا، نعمتوں و راحتوں کا! اب ہمیں ایسا کرنا چاہئے، اور خوب خوب کرنا چاہئے! وحی غیر متلو کے الفاظ میں ہمیں کہنا چاہئے،

اللّٰھُمّ لک الحمد کالذی تقول، و	حق تعالیٰ آپ کے لئے کل حمد ہے جیسی کہ آپ
خیراً مما نقول، اللّٰھُمّ لک	فرماتے ہیں اور اس سے بڑھکر کہ ہم کہتے ہیں!
الحمد کلّہٗ ولک الشکر	حق تعالیٰ آپ ہی کے لئے تعریف ہے سب کی
کلّہٗ ولک الملک کلہ، ولک الخلق	اور آپ ہی کے لئے شکر ہے سب کا، اور آپ
کلّہٗ بیدک الخیر کلہ، الیک یرجع	ہی کے لئے حکومت ہے سب کی، اور آپ ہی
الامر کلّہٗ!	کے لئے ہے مخلوق سب کی، آپ ہی کے ہاتھ میں
	بھلائی ہے سب کی اور آپ ہی کی طرف امور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی کَفَانِی وَاٰوَانِی وَاَطْعَمَنِی وَسَقَانِی وَالَّذِی مَنَّ عَلَیَّ وَاَفْضَلَ وَالَّذِی اَعْطَانِی فَاَجْزَلَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ،

سب تعریف اس اللہ کی ہے جو مجھکو کافی ہوا اور جس نے مجھ کو ٹھکانا دیا، اور کھلایا، اور پلایا، اور مجھ پر احسان اور فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی، اور بہت دی ہر حال میں اللہ کا شکر ہے،

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ،

اے اللہ تجھکو ایسی تعریف ہے جو تیری ذات کی بزرگی، اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو،!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک پختہ یقین، باطنی وقوف، براہ راست وجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماوراء ہوتا ہے، اسکی کیفیت کا الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں،!

"انہ علی کل شیئ قدیر وبالاجابۃ جدیر، نعم المولیٰ ونعم النصیر"!

۲- اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں جن کے ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لئے شکر ادا کریں، جنکی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہو! ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، اُن کے لئے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان ہے (ان تیسیر کل عسیر علیک یسیر) پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا، وہ اب بھی وہ کر سکتے ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لئے ہم اُن کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ہماری دعا سُن لی، اس نعمت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے، پردۂ غیب سے قطعاً

ہو رہا ہے، اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی، ہماری مراد وہاں ہمیں مل چکی،! ہمارا ایمان اس لامتناہی قوت پر ہے، جس کے لئے ہر دشوار آسان ہو، جس کے لئے ہر نا ممکن ممکن ہے، اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں،! یہی تاکید ہم ہمارے محبوب و مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی

اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ،

تم دعا مانگو، اور تم کو اُس کے قبول ہونے کا یقین ہو،

حق تعالیٰ کا ایک نام مجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے! ان کا ارشاد ہے

ادعونی استجب لکم،

مجھ کو پکارو میں تمھاری درخواست قبول کر لوں گا،

اجیب دعوۃ الداع اذا دعانِ

جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات کا جواب دیتا ہوں،

من یدعونی فاستجیب لہ،

کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اُس کی دعا قبول کروں،

ما من مسلم یدعو بدعاءٍ الا استجیب لہ،

جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اُس کی دعا قبول ہوتی ہے،

یہ اور اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں، جس کی ہمیں حاجت ہے، اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردۂ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے،

بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو،! وہ ظہور نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی،! جو شخص نعم النبی کے لئے

ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے، اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمانِ کامل کی دولت سے محروم ہے، شکرگذار (شکار) ذاکر، (ذکار) و مطیع و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے، جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رُخ اس ذات کی طرف کئے ہوئے ہیں، جو "فاطر سمٰوات و ارض" ہے، اس کے ثنا خوان ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کر رہے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیر محض ہیں، رحمتِ مطلق ہیں، فکر تام ہیں، کمالِ مطلق ہیں، محسن ہیں، مکرم و منعم ہیں مفضل ہیں، وہاب ہیں، نافع، رحمٰن و رحیم ہیں، مجیب ہیں، آپ ہمارے حالات میں کامل الٰہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے، لا ملجاء ولا منجاء الا الیك!

اس دعا و ثنا کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے، اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ و وقار، سرور کا مبدأ فیاض کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیت محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری دعائیں عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا، اگر ابھی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، معاملات ویسے ہی نازک ہیں، لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں"!

اس یقین و مسرت و سکینت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اُن کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کیلئے اس بخشش و فضل کیلئے جسکا ابھی ظہور نہیں ہوا اور جسکا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لئے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدم ظہور و عدم وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانیہ سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس بار پسندیدہ کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں، جن کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیءٍ و الیہ ترجعون!

جامی از یار پسندیدہ مبر دیدہ حاشا

کان پسندیدہ جز کار پسندی نکند!

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے، اور وہ ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعا کے لئے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لئے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہئے کہ مبدأ فیاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے، جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی، اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں گی، مومن اپنی ایمانی قوت ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامران ہوتا ہے،

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی ظہور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کیلئے ہو رہا ہے، اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اسلئے بجائے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا چاہئے، یہ ہمارے ایمان کی عظیم آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے:-

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ دَوَامِکَ وَلَکَ الْحَمْدُ خَالِدًا مَعَ خُلُودِکَ وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَھٰی لَہٗ دُوْنَ مَشِیْئَتِکَ وَلَکَ الْحَمْدُ لَا یُرِیْدُ قَائِلُہٗ اِلَّا رِضَاکَ وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْدَ کُلِّ طَرْفَۃِ عَیْنٍ وَتَنَفُّسِ اَللّٰھُمَّ اَقْبِلْ بِقَلْبِیْ اِلٰی دِیْنِکَ وَاحْفَظْ مِنْ وَرَائِنَا بِرَحْمَتِکَ! اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْنِیْ اَنْ اَزِلَّ وَاھْدِنِیْ، اَنْ اَضِلَّ،

(کنزالعمال عن ابی الدرداء و علی)

اے اللہ حمد تیرے ہی لئے ہے ایسی حمد کہ تیری ہمیشگی کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ رہے، اور تیرے ہی لئے حمد ہے، ایسی حمد کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم رہے، اور تیرے ہی لئے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کی انتہا تیری مشیت کے ادھر نہین ہو، تیرے ہی لئے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کے قائل کا مقصود تیری ہی خوشنودی ہے، اور تیرے ہی لئے حمد ہو ایسی حمد جو ہر پلک جھپکانے اور ہر سانس لینے کے ساتھ ہو، اے اللہ میرے دل کو اپنے دین کی طرف متوجہ کردے، اور ہماری حفاظت ہمارے اوپر سے رکھ، اپنی رحمت کے ساتھ! اے اللہ مجھے ثابت قدم رکھ کہ کہیں ڈگ نہ جاؤن اور مجھے ہدایت پر رکھ

ہم اس دعا مین مصروف رہتے ہین حق تعالیٰ کی ثنا و حمد مین مشغول رہتے ہین، یہان تک کہ ہمین اس کی کوئی پرواہ نہین رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پردۂ غیب سے ظاہر ہوا ہے کہ نہین! اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایان ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب مین خطور نہین کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا مین صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہین! رضا و موافقتِ مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم مین کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعلِ حق مین غائب و فانی ہو جاتے ہین،!

آمد خبرے ز آمد او | من بعد خبر نماند مارا

یہی شیخ جیلی کے الفاظ ہین، "الراحۃ الکبریٰ والجنۃ المعجلۃ فی الدنیا والآخرۃ"، یہ اسی کا نام اطمینانِ قلب ہے جس کی طرف اس آیۂ کریمہ مین اشارہ کیا گیا ہے،

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ! (پ ۱۳ ع ۱۰)

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہو گئے، ہان اللہ ہی کے ذکر سے دل کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے،

اطمینانِ قلب یا نفسِ مطمئنہ کے حصول کے بعد بندۂ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر جنت ذات مین داخل ہو جاتا ہے،:-

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ!!! (پ ۳۰ ع ۱۴)

یہی حریتِ تامہ ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور اُن سے راضی و مسرور رہنا:-

یار با ماست چہ حاجت کہ زیادہ طلبم
دولتِ صحبتِ آن مونسِ جان ما را بس (حافظ)

قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ،!

اصحابِ فیل کا واقعہ

اور

اُس کی تاریخ

از مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

(۲)

طیر | ان تمام تفصیلات کو خدا نے حذف کرکے قرآن میں صرف اتنا کہ کیا تجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اُن کی کارروائی کو ملیامیٹ نہیں کر دیا، پھر ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں بھیجیں،

یہ چڑیاں یقیناً مردار خوار چڑیاں تھیں، جو مردوں کو کھانے کے لئے آتی تھیں، عرب میں ایک طویل زمانے سے کشت و خون کا بازار گرم تھا، لڑائیاں ہوتی تھیں، اور بسا اوقات اتنے آدمی مرتے تھے کہ لوگ اُن کی لاشیں میدان میں چھوڑ جاتے تھے، اور یزید بن الصمہ کا شعر ہے کہ

فان تنج تدمی عارضاک فاننا　　ترکنا بنیک للضباع وللرخم

زخمی منہ لئے اگر تو بھاگ نکلا ہے، تو ہم نے تیرے بیٹوں کو بجوؤں اور گدھوں کے لئے چھوڑ دیا ہے،

اصحاب فیل کی جنگی کوششوں اور تدبیروں کی ناکامی کے ذکر کے عین بعد ارسال طیر کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حملہ آور نے بری طرح شکست کھائی تھی، اور اپنے زخمیوں اور مردہ لاشوں کو میدان میں چھوڑ بھاگے، جن پر مردار خوار چڑیاں ٹوٹ پڑیں، بعض روایات کے مطابق یہ چڑیاں مردار خوار نہ تھیں

بلکہ کچھ اور قسم کی تھیں، مگر بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مردار خور تھیں، چنانچہ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے تخریج کی ہے،

كانت طيرًا لها خراطيم كخراطيم الطير وأكف كأكف الكلاب　　ان چڑیوں کی چونچیں تو چڑیوں کی سی تھیں، مگر پنجے کتے کے پنجے معلوم ہوتے تھے،

حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں:-

طيرًا خضرٌ لها مناقير صفر　　اُن کا رنگ ہرا تھا، مگر اُن کی چونچیں پیلی تھیں،

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ

كانت طيرًا خضرًا لها رؤس كرؤس السباع،　　وہ چڑیاں تھیں ہرے رنگ کی، مگر ان کے سر درندوں کے سے تھے،

چڑیوں کا یہ حلیہ ان کی پوری حقیقت ظاہر کرتا ہے، بعض روایتوں میں ان چڑیوں کا رنگ سیاہ بتایا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہر چڑیا کی چونچ اور چنگل میں سنگریزے تھے، جن سے وہ اصحاب فیل کو مارتی تھیں، مگر یہ روایتیں کسی ایسے شخص پر منتہی نہیں ہوتیں جس کے بیان کو حضرت ابن عباسؓ کی فکر کا قرار دیا جا سکے، لیکن یہ ناممکن بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ مردار خوار چڑیوں کے علاوہ دانہ کھانے والی چڑیاں بھی اس امید میں آئی ہوں کہ ان کو دانہ مل جائے گا، مردار خوار چڑیوں کا پتھر پھینکنا بھی خلاف قیاس نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ جب وہ کسی گوشت کے لوتھڑے پر لپکتی ہوں تو جنگل میں محصب کے کنکر بھی لیکر اڑتی ہوں اور وہ کنکر اصحاب فیل پر گرتے ہوں، مگر قرآن میں جیسا کہ محل استعمال بتاتا ہے طیراً ابابیل یعنی پے در پے آنے والی چڑیوں کی آمد سے مراد یقینی طور پر یہ ہے کہ گوشت خور چڑیوں کا جھنڈ ان پر ٹوٹ پڑا تھا،

رمی حجارہ | ارسال طیر کے ذکر کے بعد خدا نے فرمایا ترمیھم اس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، وہ

مارتی تھین، (۳) تو مارتا تھا،

اصول فقہ کے ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر اس قسم کے ذو معانی الفاظ کسی عبارت مین ہون تو بیک وقت دونون معنی مراد نہین لئے جا سکتے، بلکہ ایک ہی مراد ہوگا، جہان تک آیات احکام کا تعلق ہے وہان تک یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے، آیات احکام از قسم محکمات ہین، محکم اس آیت کو کہتے ہین جسکا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہو، اگرچہ محکم آیتون مین بھی ذو معانی الفاظ ہوتے ہین، لیکن سیاق وسباق اور محل کلام ایک معنی کو اس طرح متعین کر دیتا ہے کہ دوسرے کا تصور نہین کیا جا سکتا، لیکن ایک ادیب بعض اوقات بالارادہ لفظ کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ سننے والا یہ تو سمجھ جاتا ہے کہ اصل مراد تو فلان مفہوم ہے، مگر اس کے ساتھ دوسرے مفہوم کی طرف بھی خیال منعطف ہوتا ہے، قرآن مین بھی ایسے متشابہ الفاظ رکھنے والی آیتین ہین، چنانچہ خود قرآن مجید مین ہے کہ

هُوَالَّذِی اَنزَلَ عَلَیکَ الکتاب مِنهُ آیاتٌ مُحکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الکتاب وَاُخَرُ مُتَشَابِهَات

اسی (توراۃ و انجیل بھیجنے والے) نے تجھ پر بھی کتاب اتاری، جس مین کچھ آیتین واضح مراد والی ہین، اور وہی کتاب کی بنیادی آیتین ہین، دوسری متشابہ آیتین ہین،

متشابہ آیتون مین لفظ اس طرح ہوتا ہے کہ سیاق وسباق ایک مفہوم کے علاوہ دوسرے مفہوم کی طرف بھی ذہن کو متوجہ ہونے دیتا ہے،

فَاَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنهُ ابتِغَاءَ الفِتنَةِ وَابتِغَاءَ تَاوِیلِهِ وَمَا یَعلَمُ تَاوِیلَهُ اِلَّا اللّٰهُ،

تو جن کے دلون مین کجی ہوتی ہے، وہ اس کے ایہامی مطلب کے پیچھے پڑ جاتے ہین فتنہ کی تلاش اور اس کے راز کی تلاش مین حالانکہ اس کا راز تو خدا ہی جانتا ہے،

متشابہ آیت کا کوئی ایسا مطلب نہین ہو سکتا، جو محکم آیتون سے لڑتا ہوا ہو، لیکن ٹیڑھی طبیعت کے

کج دماغ والے محکم آیتون کو متشابہ آیتون سے ٹکرا دینے کی کوشش کیا کرتے ہین،

وَالرَّاسِخُونَ فِی العِلمِ یَقُولُونَ آمَنَّا کُلٌّ مِّن عِندِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الاَلبَاب،

مگر جن کا علم استوار ہے، وہ کہتے ہین کہ ہم کو تو ایمان ہے کہ ہر ایک بات ہمارے رب کی جانب سے ہے، مگر سمجھ وہی سکتے ہین، جو سمجھ دار ہین،

ایک ادیب جب کسی لفظ کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ حقیقی مطلب کے سوا سننے والے کا خیال کسی اور مطلب کی طرف بھی جا سکے تو بعض اوقات دوسرا مفہوم محض ایہام ہوتا ہے، اس کا صحیح ہونا ضروری نہین ہوتا، لیکن قرآن کے کسی لفظ کے ایہامی مطلب کا بھی غلط ہونا غیر ممکن ہے، کیونکہ

اِنَّهُ لَکِتَابٌ عَزِیزٌ لَا یَاتِیهِ البَاطِلُ مِن بَینِ یَدَیهِ وَلَا مِن خَلفِهِ،

وہ نہایت استوار کتاب ہے، باطل اس کے قریب نہین آتا، نہ تو اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے،

اس لئے ترمیھم بولکر اس کے دو معنی مین سے ایک کو خدا نے بطور اصل مقصود مراد لیا ہے، اور دوسرے معنی کی طرف لطف کلام کے لئے ایہام کیا ہے، اصل مقصود تو ظاہر کلام کے مطابق یہ ہے کہ

"تو تو انھین صرف سجیل کے پتھرون سے مارتا تھا، مگر اُس نے اُن کو ایسا بنا دیا، جیسے کہ وہ کھایا ہوا بھس تھے،

لیکن ایہام اس حقیقت کی طرف کیا کہ ان پر چڑیان بھی کنکر برساتی تھین، عام مفسرین نے اسی ایہامی مفہوم کو ترجیح دیدی جو واقعہ کے اعتبار سے غلط بھی نہین تھا، نفیل خثعمی نے جو کہ واقعہ کا عینی شاہد ہے ایک شعر مین کہا ہے کہ

حَمِدتُ اللّٰهَ اِذ عَایَنتُ طَیرًا وَخِفتُ حِجَارَةً تُلقٰی عَلَینَا

رُدینہ لو رأیت ولا تریہ لدی جنب المحصب ما رأینا

میں نے خدا کا شکر ادا کیا، جب میں نے چڑیاں دیکھیں، اور مجھے خوف ہوا کہ ہم پر بھی
پتھر نہ برسیں، اے ردینہ محصب کے پاس جو ہم نے دیکھا کاش تو نے بھی دیکھا
ہوتا، مگر اب تو کبھی یہ ماجرا نہ دیکھے گی،

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ چڑیوں کی سنگ باری کا خوف نفیل کو بھی ہوا تھا، جو بطور اسیر ابرہہ
کی فوج میں تھا، عبد اللہ بن الزبعری کا یہ شعر صورتِ واقعہ کو اور بھی ظاہر کر دیتا ہے،

فانسلت علیہم الطیر بالجندل حتی کانہ مرجوم

چڑیاں اُن کے اوپر پتھر کے ساتھ ٹوٹ پڑیں، یہاں تک کہ وہ ایسا ہو گیا
جیسے کہ اس پر پتھراؤ کیا گیا ہو،

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ زخمی اصحاب فیل کو سب سے زیادہ تکلیف ان سنگ ریزوں سے پہنچی، جو اُن پر چڑیوں
کے چنگل سے گرتے تھے، لیکن حقیقی مفہوم ترمیہم کا یہی ہے کہ تو مارتا تھا،

تاہم مفسرین نے واقعہ کی جس صورت کو زیادہ شوق سے بتایا ہے اسے بھی منشائے متکلم کے خلاف نہیں
قرار دیا جا سکتا، اگر خداوند عالم کا مقصود یہ ہوتا کہ "ترمیہم" کا وہی مطلب لیا جائے، جو لفظ سے متبادر ہے
تو رمی حجارہ کا ذکر ارسالِ طیر سے پہلے ہوتا،

سجیل | ہم نے جس دلیل سے "ترمیہم" کا اصلی مفہوم "تو مارتا تھا" ظاہر کیا ہے، اور "وہ مارتی تھیں"
کو ایہامی قرار دیا ہے، وہ لفظ سجیل میں مضمر ہے، سجیل وہ پتھر نہیں ہو سکتا جسے چڑیاں پھینک سکتی ہوں،
سجیل کو عام طور پر سنگ و گل کا معرب سمجھا جاتا ہے، اور تو اور اس دور کے امام التفسیر علامہ فراہی
رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے معرب مانا ہے، غالباً انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ایک قول
کی بنا پر یہ بات فرمائی ہے،

لغت کی تحقیق میں بڑے بڑے اکابر روایتوں کو پرکھنے کا وہ اصول مرعی نہیں رکھتے، جو واقعات
واحکام سے متعلق روایتوں کے سلسلہ میں برتتے ہیں، اگر ہم لغت کی تحقیق کو بھی اسی قدر اہمیت دیں جس قدر
واقعات واحکام کی تحقیق کو دیتے ہیں، تو اس قول کا استناد حضرت ابن عباسؓ کی طرف مشکوک ہو جاتا
ہے، امام ابن جریر نے اس قول کو جن سندوں سے نقل کیا ہے اُن کی تشریح حسب ذیل ہے،

عکرمہ

- السدی
  - سفیان
    - عبد الرحمان
      - ابن بشار
    - مہران
      - ابن حمید
- الشرقی
  - شعبہ
    - محمد بن جعفر
      - ابن المثنی،
- عمارہ بن ابی حفصہ
  - یزید بن زریع
    - حسین بن محمد الذارع
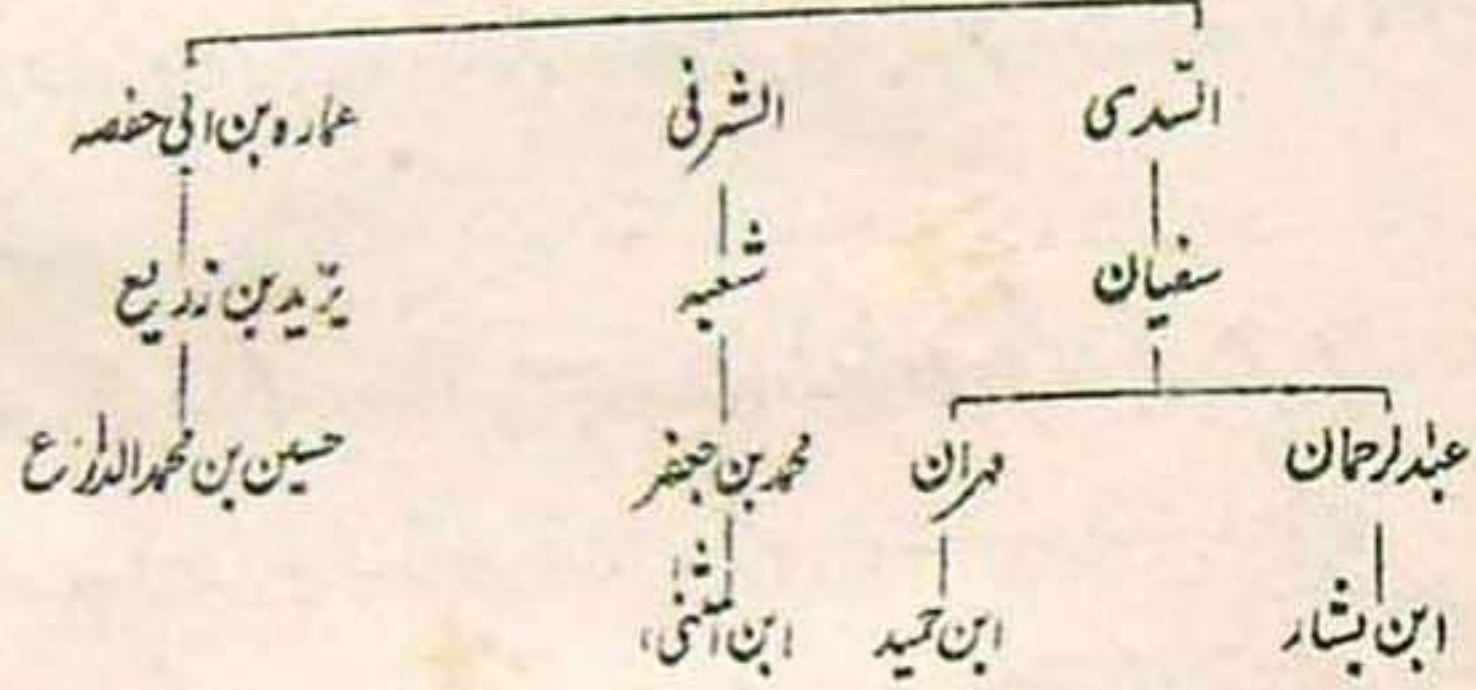
السدی کی روایت میں حضرت عکرمہ سے اوپر حضرت ابن عباسؓ کا نام ہے، باقی دو بزرگ قول کو
حضرت عکرمہ پر منتہی کرتے ہیں،

چونکہ حسین بن محمد کی روایت میں واسطے کم ہیں، اس لئے یہ زیادہ معتبر ہے، حسین بن محمد کے قول کے مطابق
حضرت عکرمہ نے "سجیل" کا مرادف "طین" کو بتایا تھا، حضرت عکرمہ کی یہ تفسیر خود قرآن کریم سے ماخوذ ہے حضرت
لوطؑ کے قصہ میں خدا نے فرشتوں کا قول ایک جگہ نقل کیا ہے،

أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ مُجْرِمِينَ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ،
ہم کو ایک مجرم قوم پر مٹی کے پتھر برسانے کو بھیجا گیا ہے

دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ

وامطرنا علیہم حجارۃ من سجیل
اور ہم نے ان پر سجیل کے پتھر برسائے،

ان دونوں آیتوں کا مقابلہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ طین اور سجیل مرادف الفاظ ہیں، ابن حمید

کی روایت یہ ہے کہ

قال طین فی حجارۃ — فرمایا کہ مٹی پتھر تلے کی،

دیکھو روایت مین ایک واسطہ بڑھا، جس سے سند مین ایک نام اور متن مین ایک لفظ اور بڑھ گیا، سجیل کے لفظ مین اگر پتھر کا مفہوم مضمن ہوتا، تو "حجارۃ من سجیل" کہنے کی ضرورت نہ تھی،

ابن حمید کے یہ الفاظ ابن بشار اور ابن المثنی کی زبان پر عربی کے بجائے فارسی بن گئے، قال "سنگ وگل" یہ "سنگ وگل" ترجمہ ہے "حجارۃ من طین" کا، یہ خیال کرنا درست نہین ہے کہ سجیل معرب ہو "سنگ وگل" کا، عربی کے چند الفاظ مثلاً

سجا البحر (سمندر ساکن ہوگیا) ارض مسجومۃ (بارش کی وجہ سے گیلی زمین) بحر مسجور (بھرا سمندر) ساجر (سیلاب کی وجہ سے بھرا ہوا گڑھا) سجلت الماء (مین نے پانی انڈیلا)

شہادت دیتے ہین کہ س ا ور ج کا ابتدائی مفہوم پانی اور بارش سے تعلق رکھتا تھا، قرآن مجید کے اندر ایک ہی چیز کے لئے ایک بار طین، اور ایک بار سجیل کا لفظ حجارۃ کا مضاف الیہ بن کر مستعمل ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ سجیل کا ترجمہ "سنگ وگل" نہین، بلکہ "آب وگل" ہوگا، پانی ملی ہوئی مٹی شدید گرمی سے اکثر و بیشتر پتھر کی سی کڑی اور سخت ہوجاتی ہے، اسی چیز کو خدا نے ایک مرتبہ حجارۃ من طین کہا اور ایک بار حجارۃ من سجیل کہا، چڑیون کے متعلق یہ خیال نہین کیا جا سکتا کہ وہ مٹی کے ڈھیلے لے کر حملہ آور ہوئی تھین، البتہ انسان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریش کے پاس سر و سامان جنگ کی قلت تھی، زمانہ جنگ کا نہ تھا، لوگ اسلحہ سے آراستہ نہ تھے، اس لئے انھون نے مقابلہ مین مٹی کے ڈھیلے بھی چلائے، اُن کا یہ اوزار اتنی بڑی فوج کو شکست کیا دیتا، آنکھون مین خاک بھی نہین جھونک سکتا تھا، لیکن خدا نے پتھریلی آندھی بھیج کر اصحاب فیل کو ایسا بنا دیا، جیسے کہ وہ کھایا ہوا بھس تھے، اور اللہ تعالیٰ کی تائید سے قریش کامیاب ہوئے، اور اصحاب فیل نے زبردست شکست کھائی، عبد اللہ بن الزبعری کہتا ہے کہ

سائل امیر الجیش عنها ما رأی — ولسوف ینبی الجاہلین علیمها

ستون الفالم یؤبوا ارضهم — ولم یعش بعد الایاب سقیمها

امیر فوج سے پوچھ جو اس نے دیکھا، جاہلون کو واقف کار خبر دے گا، ان مین سے ۶۰ ہزار اپنے دیس کو واپس نہ جا سکے، اور واپسی کے بعد زخمی زندہ نہین رہے،

عصف ماکول — اصحاب فیل کی شکست کی تصویر خدا نے انھین "عصف ماکول" سے تشبیہ دیکر کھینچی ہے، زراعت کا وہ جزو جو جانورون کے کھانے مین آتا ہے، کھایا ہوا بھس بالکل ناکارہ اور بے جان ہوتا ہے، اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہین رہتی، اُن کی اس ہزیمت کے لئے اس تشبیہ سے بہتر تصویر کشی نہین ہو سکتی، غالباً اس تشبیہ سے اصحاب فیل کے ہم قومون اور اُن کی امت والون کو یہ بھی یاد دلانا مقصود تھا کہ تمھاری کتب مقدسہ مین پہلے سے یہ بتا دیا گیا ہے کہ "شریرون کا انجام یہی ہوتا ہے کہ جب ان کی سرکشی بڑھ جاتی ہے، تو وہ اس بھس کی مانند ہو جاتے ہین جس کو ہوا اڑائے پھرتی ہے" (زبور ۱-۵، و یسعیاہ ۱۷: ۱۳)

اصحاب فیل کے "عصف ماکول" ہوجانے کا اثر یہ ہوا کہ واقعہ فیل کے بعد ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ یمن سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، حبش مین بھی انقلاب برپا ہوا، اور وہان بھی ایک دوسری حکومت قائم ہوگئی،

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱- اہل حبش نے عرب کو غلام بنانے کی غرض سے مکہ پر حملہ کیا تھا،

۲- اُن کا ارادہ مکہ کو ڈھا دینے کا تھا،

۳- اور اس کے لئے وہ دس لاکھ کی فوج لے کر بڑے سر و سامان سے چڑھے تھے کہ ایک ہی ریلے مین سارے عرب کو زیر کرلین،

۴- عربون نے متعدد جگہ ان کا ناکام مقابلہ کیا،

۵۔ جب وہ مکہ کے پاس پہنچے تو عربون کے پاس اُن سے لڑنے کے لئے مٹی کے پتھرون کے سوا کوئی اوزار نہین تھا، تاہم انھون نے ہمت نہین ہاری اور اسی سے مقابلہ کیا،

۶۔ اور خدا نے پتھریلی آندھی بھیج کر اُن کے دشمنون کو شکست دی،

۷۔ اور مردار چڑیون کو ان پر مسلط کر دیا، جو اُن کی لاشون کو نوچ نوچ کر کھانے لگین،

۸۔ اور ۶۰ ہزار کشتے چھوڑ کر یہ فوج بھاگی، واپسی کے بعد زخمی بھی زندہ نہین بچے،

عرب مین سب سے پہلے چیچک اسی سال نمودار ہوئی، اس لئے ہر بات کو اپنی عقل کے مطابق ماننے والے بعض نئے مفسرین یہ خیال کرتے ہین کہ اصحاب فیل کی ہلاکت چیچک کی وجہ سے ہوئی، مگر یہ خیال واقعہ کا عکس ہے، اصحاب فیل کو قدرتی خشت باری نے ہلاک کیا، اُن کی لاشین عرصہ تک میدان مین پڑی سڑتی رہین، جس سے وبا پھیل گئی، اس کے بعد سیلاب آیا، جو لاشین بہا لے گیا، لیکن اس واقعہ کا تعلق سورۂ فیل کی کسی آیت سے نہین ہے،

اجلاس آل انڈیا اورینٹیل کانفرنس منعقدہ لکھنؤ یونیورسٹی

گذشتہ مہینہ ۲۳،۲۴،۲۵؍اکتوبر کو آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا سولھوان اجلاس لکھنؤ یونیورسٹی مین ہوا، ہندوستان اور بیرون ہند کے تعلیمی اور علمی ادارون کے چار ساڑھے چار سو نمایندون نے اس مین شرکت کی، آنریبل وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اجلاس عام کا افتتاح اور پنڈت نیلکنٹھ شاستری نے اس کی صدارت کی، افتتاحی تقریرون مین یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر مسٹر نرندر دیو کی تقریر بہت موزون و مناسب تھی، اجلاس سے متعلق مخطوطات کی ایک نمائش بھی تھی جس مین قلمی کتابون، فرامین، کتبات، تصویرون، مرقعون اور دوسرے نوادر کا اچھا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا، اس مین سید مسعود حسن صاحب رضوی کے ذاتی کتب خانہ کے نوادر خصوصیت کے ساتھ زیادہ اہم تھے،

اگرچہ یہ اجلاس مختلف حیثیتون سے کامیاب رہا، لیکن ایک بات کا اظہار ضروری ہے، آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس ایک خالص علمی ادارہ ہے، اس کو تنگ نظری اور فرقہ پروری سے بلند ہونا چاہئے، مگر یہ مرض اتنا عام ہو چکا ہے کہ یہ ادارہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، اور مختلف تقریبون مین اس کے اثرات اور ہندو کلچر کے احیاء کا تصور نمایان تھا، جس کی تفصیل کچھ خوشگوار نہین ہے، سب سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ اردو کے مقامی صحافیون کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، جن کی عدم شرکت سے بڑی کمی رہ گئی، گو دوسرے شعبون کے مقابلہ مین عربی، فارسی، اردو اور اسلامک کلچر کے شعبون مین نمایندون کی تعداد کم تھی، لیکن ان شعبون کے لائق صدر و سکریٹری ڈاکٹر حمید مرزا، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی اور آل احمد صاحب سرور کی کوششون سے ان کے مقالات کی تعداد توقع سے زیادہ تھی، راقم الحروف نے

"اردو کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت" پر مقالہ پیش کیا تھا جو انشاء اللہ معارف کے آیندہ نمبر میں شائع ہوگا، باقی مقالات اور ان کے نامہ نگاروں کی تفصیل حسب ذیل ہے،

مقالات شعبۂ عربی و فارسی اس شعبہ کے صدر ڈاکٹر نظام الدین احمد جامعہ عثمانیہ منتخب ہوئے تھے مگر وہ وقت پر نہ پہنچ سکے، اس لئے ان کے بجائے ڈاکٹر وحید مرزا نے صدارت کے فرائض انجام دئیے، اس شعبہ میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے،

۱۔ "عربوں کے فن تاریخ نویسی پر سرسری نظر": ڈاکٹر عبد العلیم صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

۲۔ "مرزا غازی بیگ ترخان اور شعراء کی سرپرستی": سید اختر مسعود ایم اے، ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی،

۳۔ "آٹھویں صدی ہجری کے ایک نادر عربی مخطوطہ کی اہمیت":۔ سید حسن عسکری پروفیسر شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی،

۴۔ "باقر آغا کے مقالہ پر ایک تبصرہ":۔ ڈاکٹر سید محمد حسین نینار صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی،

۵۔ "گلزار ابراہیم اور خوان خلیل":۔ ڈاکٹر نذیر احمد ام اے پی ایچ ڈی، لٹ لکھنؤ یونیورسٹی،

۶۔ "حیدرآباد کے ہندو شعراء اور مصنفین کا حصہ فارسی ادبیات میں":۔ از ڈاکٹر سید کلیم اللہ حسینی ام اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

۷۔ "یوگ وشست اور گیتا کا فارسی ترجمہ":۔ از ڈاکٹر وکرماجیت حسرت ام اے پی ایچ ڈی نابھا (مشرقی پنجاب)

۸۔ "حالات وحشی": ڈاکٹر نذیر احمد ام اے، پی اچ، ڈی، ڈی لٹ، لکھنؤ یونیورسٹی،

۹۔ "عربی زبان کے ہندوستانی اہل قلم":۔ مولانا احمد بن عثمان گجراتی، استاد، ندوۃ العلماء، لکھنؤ،

۱۰۔ "رباعیات دوانی": از پروفیسر بھگوت دیال ورما، ام اے، منشی فاضل، ادیب فاضل، پروفیسر فرگسن کالج پونا،

۱۱۔ "گجراتی کائستھ اور فارسی": از ڈاکٹر، ار، نایک پروفیسر انسٹیٹوٹ آف ریسرچ، احمدآباد،

۱۲۔ "وصافی":۔ از ڈاکٹر رام کمار چوبے پروفیسر ہندو یونیورسٹی،

۱۳۔ "عربی زبان کی تعلیم کی اہمیت پر تقریر":۔ سید المامون اشافعی، لکچرار شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

شعبۂ اسلامک کلچر اس شعبہ کی صدارت ڈاکٹر وائی ڈی، اہوجہ نے کی، اور اس میں حسب ذیل مقالے پیش کئے گئے،

۱۔ "سلطان محمود غزنوی کے تعلیمی و علمی اوصاف":۔ ڈاکٹر رام کمار چوبے ہندو یونیورسٹی،

۲۔ "شاہ ولی اللہ اور مسئلہ جبر": پروفیسر محمود الشبتری،

۳۔ "امیر معاویہ کا نظام حکومت": محمد اقبال انصاری ندوی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی

۴۔ "عہد مامون میں بغداد کی تمدنی معاشرتی، اور اقتصادی زندگی"، ڈاکٹر شمشیر بہادر صمدی لکھنؤ یونیورسٹی

۵۔ "شیخ عراقی کا قیام ہندوستان میں": ڈاکٹر وائی ڈی، اہوجہ،

۶۔ "نظام الملک طوسی":۔ ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی،

۷۔ "ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور":۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھنؤ یونیورسٹی،

مقالات شعبۂ اردو اس شعبہ کی صدارت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے کی، اور حسب ذیل مقالات پڑھے گئے،

۱۔ "بمبئی میں اردو":۔ سید نجیب اشرف صاحب ندوی پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی

۲۔ "میر مرثیہ نگار کی حیثیت سے":۔ پروفیسر مسیح الزمان صاحب لکچرار اردو، الٰہ آباد، یونیورسٹی،

۳۔ "نظیر اکبرآبادی":۔ ڈاکٹر رام کمار چوبے ہندو یونیورسٹی،

۴۔ "نصرتی کے علی نامہ میں قصیدہ عاشورہ":۔ پروفیسر بھگوت دیال ورما، فرگسن کالج، پونا،

۵۔ "اردو کے لئے رومن یا ناگری رسم الخط": سری ستیش گوہا ٹھاکر بنارس،

۶۔ "لالہ لچھمن نرائن شفیق اور ان کی مثنوی تصویر جاناں":۔ پروفیسر عبد القادر سروری عثمانیہ یونیورسٹی،

۷۔ "اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت": شاہ معین الدین احمد ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ،

۸۔ "فسانۂ آزاد کی خصوصیات": پنڈت کشن پرشاد کول

۹۔ "غالب کی بعض تحریرین": خواجہ احمد فاروقی لکچرار دہلی یونیورسٹی،

ان کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اساتذہ سید مسعود حسن صاحب رضوی آل احمد صاحب سرور اور سید احتشام حسین صاحب نے بھی مقالات لکھے تھے جو وقت کی تنگی کی بنا پر نہ پڑھے جاسکے،

کانفرنس کا آیندہ اجلاس احمد آباد مین ہوگا، اس کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ہماری جماعت کے ایک فاضل اور دار المصنفین کے سابق رفیق سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسماعیل کالج بھی قرار پائے ہین، امید ہے کہ اس اجلاس مین بھی عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کے فضلا ان شعبون کو کامیاب بنائین گے، (م)

نواے حیات

از

جناب یحیٰ اعظمی

جناب یحیٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نواے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ اور مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک مختصر سی تقریظ ہے، جو بجاے خود قابلِ مطالعہ ہے،

قیمت: مجلد للعہ غیر مجلد ہے

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر ایشوری پرشاد آج کل الہ آباد یونیورسٹی مین شعبۂ پالٹیکس کے صدر ہین، اُن کی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف مڈیول انڈیا ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل ہے، انھون نے اپنی اس کتاب مین ہندوستان کے مسلمان حکمرانون پر جا بجا نکتہ چینی بھی کی ہین، لیکن اس کے آخری باب مین مڈیول سویلیزیشن (ازمنۂ وسطیٰ کا تمدن) کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس کے خاص خاص حصے کی تلخیص ہم ذیل مین درج کرتے ہین، تاکہ ناظرین کو یہ اندازہ ہو کہ ایک سخت سے سخت ناقد بھی ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہے، ڈاکٹر ایشوری پرشاد رقمطراز ہین،

اقتصادی خوشحالی

ہندوستان کے اسلامی عہد کے ابتدائی دور مین تو مسلمان سلاطین علاقون کی تسخیر مین بے حد مشغول رہے، لیکن بلبن پہلا حکمران ہے جس نے اندرونی امن و امان قائم کرنے کی طرف توجہ کی، اُس نے کمپیلا اور پٹیالی کے نواح کو لٹیرون اور قزاقون سے بالکل پاک کر دیا، جس سے ان علاقون مین زراعت کو ترقی ہونے لگی، اور سوداگر آزادی کے ساتھ اپنا مال و اسباب لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے، اور خلجیون کے زمانہ مین اقتصادی حالات مین ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہوگیا، ملک مین دولت کی کمی نہ تھی، علاء الدین اپنی تخت نشینی کے بعد جب دہلی مین داخل ہوا، تو لوگون مین قیمتی تحفے تقسیم کیے

منجنیق مین پانچ من سونا بھر کران تماشائیون مین لٹایا گیا، جو شاہانہ جلوس دیکھنے کے لئے آئے تھے، اسی بادشاہ نے ایسے قوانین جاری کئے، جن سے تمام چیزون کی قیمتین گر گئین، اس زمانہ مین ایک لشکری اپنے گھوڑے کے مصارف کے ساتھ ۲۳۴ ٹنکے مین سال بھر فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکتا تھا، یعنی مہینہ مین بیس ٹنکے سے بھی کم خرچ کرتا تھا، اتنی قلیل رقم مین آج کل کوئی شخص ایک گھوڑا بھی نہین رکھ سکتا، شاہی گدامون مین غلہ بھرا رہتا جو ضرورت کے وقت کم قیمت مین لوگون کو دیا جاتا تھا، ابن بطوطہ نے اپنی آنکھون سے علاء الدین کے اس گدام کو دیکھا تھا جس مین غلہ جمع کیا گیا تھا، لیکن علاء الدین کے بعد اس کے قوانین کی پابندی نہ کی جا سکی، برنی نے اس کا رونا رویا ہے کہ علاء الدین کے بعد سستی چیزین مفقود ہو گئین، لیکن کبھی غلے کی کمی محسوس نہین کی گئی، اور نہ حکومت کو کبھی مالی دقت پیش آئی، ناصر الدین خسرو نے لوگون کو اپنا حامی بنانے مین بے شمار دولت برباد کی، پھر بھی محمد تغلق کو اتنی دولت ملی کہ وہ طرح طرح کے بیش قیمت تجربے کرتا رہا، محمد تغلق اپنے نقطۂ نظر سے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے مین ناکام رہا، لیکن اس کی مالی حالت کبھی خراب نہین ہوئی، اس کے زمانے مین دس سال تک قحط رہا، لیکن حکومت نے اس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، برنی کا بیان ہے کہ دو سال مین کسانون کو ستر لاکھ ٹنکے بطور تقاوی دیئے گئے، شاہی گدام سے عام لوگون کو غلہ دیا گیا، قاضی ہر گاؤن کے ضرورتمندون کی ایک فہرست تیار کرتے، جو بادشاہ کی خدمت مین پیش کی جاتی، جب غلہ کی بہت زیادہ کمی ہو گئی تو امرا، قاضی اور دوسرے سرکاری عہدیدارون نے گاؤن گاؤن جا کر فی کس ڈیڑھ رطل یومیہ غلہ تقسیم کیا، بڑی بڑی خانقاہون نے بھی ان امدادی کامون مین حصہ لیا، حضرت قطب الدین کی خانقاہ مین جس کا متولی ابن بطوطہ تھا، سیکڑون آدمیون کو کھانا ملا کرتا تھا، اس خانقاہ مین ۴۶۰ کارکن تھے،

صنعتی و تجارتی ترقی حکومت نے صنعت و حرفت کو فروغ دینے مین بھی فیاضانہ مدد کی، ریاست کی طرف سے ایک ایسا کارخانہ تھا جس مین چار سو ریشم بننے والے کام کرتے تھے، اس مین ہر قسم کے

ریشمی کپڑے تیار کیے جاتے تھے، خاص سلطان کے یہان پانچ سو زردوز تھے، جو شاہی خاندان اور امرا کے لئے کپڑے تیار کرتے تھے، بیرونی ملکون سے تجارت برابر جاری رہی، مارکوپولو اور ابن بطوطہ ایسی بہت سی بندرگاہون کا ذکر کرتے ہین، جہان بیرونی تاجر ہمیشہ آتے رہتے تھے، بھروچ اور کالی کٹ تجارت کے بہت بڑے مرکز تھے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ کالی کٹ مین دنیا کے ہر حصہ کے تاجر مال خریدنے کے لئے آیا کرتے تھے، مسالک الابصار کے مؤلف کا بیان ہے کہ ہر ملک کے تاجر ہندوستان مین خالص سونا لاتے، اور اس کے تبادلہ مین گوند اور دواؤن کی جڑی بوٹیان لے جاتے تھے، حکومت ان بیرونی تاجرون کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتی تھی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک تاجر سید ابو الحسن عابدی کو تجارت کرنے کے لئے شاہی خزانہ سے سرمایہ دیا جاتا تھا، اور وہ بادشاہ کے لئے عراق اور خراسان سے ضروری چیزین لایا کرتا تھا، تیرھوین اور چودھوین صدی مین ہندوستان کی تجارتی حالت خاطر خواہ رہی، وصاف گجرات کے بارہ مین لکھتا ہے کہ یہ بہت ہی متمول اور آباد خطہ ہے جہان سات ہزار گاؤن اور قصبے ہین، اور یہان کے لوگ دولت سے کھیلتے ہین، یہان کی کھیتی بڑی ہری بھری ہوتی ہے، انگور کے باغ مین نیلے نیلے انگور سال مین دو مرتبہ ہوتے ہین، زمین اتنی زرخیز ہے کہ روئی کے پودے بید اور چنار کے درختون کی شاخون کی طرح پھیلے نظر آتے ہین، مارکوپولو بھی روئی کی کھیتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ پودے چھ چھ فیٹ لمبے ہوتے ہین، اور بیس بیس برس تک قائم رہتے ہین، کالی مرچ، ادرک، اور نیل بکثرت ہوتی ہے، مقامی صناع سرخ اور نیلے چمڑے کے فرش تیار کرتے ہین، جن پر پرندون اور جانورون کی شکلون کے علاوہ طلائی و نقرئی نقش و نگار بھی ہوتے ہین، کھنبائت بھی تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، یہان نیل کی کاشت بکثرت کی جاتی تھی، بیرونی ممالک کے تاجر بہت سا سامان یہان لاتے تھے، اس مین سونا، چاندی، اور تانبا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتا، معبر مین بھی دولت کی بڑی فراوانی تھی، لیکن اس علاقہ مین گھوڑون کی بڑی کمی تھی، اس لئے یہان کے لوگ گھوڑون کی خریداری

مین اپنی دولت زیادہ صرف کرتے تھے، کیش، ہرمز، دوفار، سوئر کے تاجر یہان گھوڑے لاتے تھے، اور کثیر منافع حاصل کرتے تھے، ابن بطوطہ اپنے زمانہ کے بنگال کے بارہ مین لکھتا ہو کہ یہ بہت ہی زرخیز اور متمول صوبہ ہے، یہان چیزین سستی ملتی ہین، اور یہان کے باشندے تھوڑی سی آمدنی مین آرام و آسایش سے زندگی بسر کرتے ہین،

۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک ہندوستان مین غیر معمولی اقتصادی خوشحالی رہی، آب پاشی کی سہولتون کی وجہ سے زراعت مین بڑی ترقی ہوئی، اور آمدنی بڑھ گئی، دہلی اور اس کے علاقہ کی آمدنی چھ کرور پچاسی لاکھ ٹنکے تھی، صرف دوآب کی آمدنی پچاسی لاکھ ٹنکے تھی، امرا اور سرکاری عہدیدارون کے پاس کثیر دولت جمع ہوگئی تھی، عفیف کا بیان ہو کہ جب ملک شاہین شحنہ کا انتقال ہوا، تو اس کے گھر سے جواہرات اور دوسری قیمتی چیزون کے علاوہ پچاس لاکھ ٹنکے نقد نکلے، ارزانی اتنی تھی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے مین کچھ زیادہ صرف نہ ہوتا تھا، دہلی سے فیروزآباد جانے مین چھکڑے کا کرایہ چار جیتیل، خچر کا چھ جیتیل، گھوڑے کا بارہ جیتیل اور پالکی کا نصف ٹنکہ ہوتا تھا، ہر جگہ قلی موجود رہتے تھے، جن کو کافی آمدنی ہوا کرتی تھی، معاصر مورخین لکھتے ہین کہ ہر شخص کے پاس چاندی اور سونا کافی ہوتا تھا، کوئی عورت بغیر زیور کے نہ ہوتی تھی، گھرون مین اچھے سے اچھے پلنگ اور بستر ہوتے، عفیف نے جو قیمتین لکھی ہین، اس سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہین کہ چودھوین صدی کے وسط مین شمالی ہند کی اقتصادی حالت بہت ہی خاطر خواہ تھی،

رواداری

یہ خیال صحیح نہین ہے کہ مسلمانون کی فتح تسخیر ہندوستان کے لئے ایک مصیبت تھی، حالات و واقعات سے اس کی تصدیق نہین ہوتی، مسلمانون کی آمد اس لحاظ سے تو مصیبت ضرور تھی، کہ ہندوؤن کی آزادی جاتی رہی، اور ایک بیرونی قوم کی حکومت شروع ہوگئی، لیکن مسلمانون نے اپنی رعایا کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا، اسی زمانہ مین اسپین کے فلپ ثانی نے یہ اعلان کیا کہ مسیحیت کے منکرون پر حکومت

کرنے سے حکومت نہ کرنا بہتر ہے، ملکہ ایلزبتھ نے آئرلینڈ کے رومن کیتھولک پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے، لیکن اسی عہد کے مسلمان حکمرانون مین شیر شاہ اور اکبر نے مفاد عامہ کی خاطر مذہبی رواداری کا سبق پڑھایا، دوسرے مذہب کے پیروؤن کی جانب خیرخواہی اور خیرسگالی کا ہاتھ بڑھایا، ہندو سردارون اور زمیندارون نے برابر مسلح بغاوتین کین، طبقات ناصری، تاریخ فیروزشاہی اور تاریخ مبارک شاہی مین ایسے بہت سے واقعات ملتے ہین، کہ ہندوؤن نے کس کس طرح سلاطین دہلی کی حکومت کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی، جب کبھی اُن کو موقع مل جاتا، وہ برسرپیکار ہوجاتے، نظام حکومت کو معطل کر دینے اور مرکزی حکومت کی عدول حکمی کے لئے تیار رہتے، اس لئے مسلمانون نے اُن کو دبایا ضرور لیکن اُن کو دبانے مین ہندوؤن کی اسپرٹ اور مردانگی کا بالکل استیصال نہین کر دیا،

کسی زمانہ مین بھی اقتصادی بدحالی نہین رہی، بعض حکمران عیاش اور فضول خرچ ضرور ہوئے لیکن انھون نے ریاست کی دولت ملک کے اندر ہی برباد کی، بلاشبہہ ہندوؤن کی بہت بڑی دولت مسلمانون کے ہاتھون مین چلی گئی تھی، لیکن مسلمانون نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا رکھا تھا، اس لئے یہان کی اقتصادی حالت ویسے ہی قائم رہی، بعض اوقات سیاسی حالات حوصلہ فرسا رہے، اور قحط کے زمانے مین مشکلون کا اضافہ ہوتا رہا، لیکن عام حالات مین کھانے کی چیزون کی کمی نہ تھی، اور آج عام طور سے جو صحت اور تندرستی خراب ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ کھانے کی ضروری اشیاء میسر نہین ہین،

سرمایۂ افتخار

یہ خیال کرنا بھی صحیح نہین ہے کہ مسلمان حکمران وحشی تھے، اور متمدن نظام حکومت کے آرٹ سے واقف نہ تھے، ازمنۂ وسطی مین ایسے بہت سے افراد پیدا ہوئے، جن پر زمانہ فخر کر سکتا تھا، بلبن اور علاء الدین خلجی بہادر سپاہی بھی تھے، اور اچھے قسم کے مدبر بھی، محمد تغلق اور ابراہیم شاہ شرقی علوم و فنون کے بہت بڑے سرپرست گذرے ہین، ناصر الدین محمود اور فیروز تغلق بڑے عابد اور صلح کل حکمران تھے، الغ خان، ظفر خان، اور ملک کافور وغیرہ بہت بڑے سپہ سالار ثابت ہوئے، اُن کی

شخصیتین ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ مین بڑی ہی دلچسپ ہین، اس عہد کے بعض حکمرانون نے اپنی ریاست کو سیکولر یعنی غیر مذہبی بنانے مین بھی دلیرانہ اقدام کیا، گو اس مین کامیابی نہین ہوئی، مگر انھون نے اس بات کی اہمیت پر کافی زور دیا کہ حکومت کو پارٹی بندی اور باہمی جھگڑون سے بلند رہنا چاہئے اور ریاست کے مفاد کو مذہبی راسخ العقیدگی پر ترجیح دینی چاہئے، لیکن وہ زمانہ اس قسم کے تخیل کے لئے موزون نہ تھا، مغلون نے اس تخیل کو عملی جامہ پہنایا، لیکن ان کو بھی اس کوشش مین زیادہ کامیابی نہین ہوئی، اُن کی حکومت اُن کے پیشرون کے طرزِ حکمرانی سے زیادہ بہتر تھی، انھون نے اپنی وسیع سلطنت کے لئے ایسے ضوابط و قوانین نافذ کئے، جن سے ان کی روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے، اور وہ ایسے کامران بھی رہے، جس سے اُن کی حکومت کی تاریخ مین شوکت و رفعت پیدا ہوگئی، لیکن اُن کے پیشرون نے جو کچھ کیا، اُن کو نہ سراہنا ناانصافی ہوگی، انھون نے راہین کھولین، اور ایک ایسے ملک مین اپنی تہذیب اور تمدن کو روشناس کرنے کی کوشش کی جو بالکل اجنبی اور مخالفانہ عناصر سے بھرا تھا، تاہم انھون نے یہان کے لوگون کا ذہن ایسے معاشرتی نظام کے لئے تیار کیا، جو اُن کے لئے بالکل نیا تھا،

(ص ، ع)

بزمِ تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہلِ قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شاہزادون، شہزادیون اور دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے بھی علم و ادب کی قدر دانی کی اور گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے، قیمت: ہ‍ ... ہیر

"مینیجر"

ادبیات

بیانِ حقیقت

از جناب شفیق صدیقی جونپوری

خرد کے آئینے مین جب نہ عکسِ امتیاز آیا
جنون آخر اٹھانے کو حجابِ روئے راز آیا

کسی دیوانے پر حیرت ہو اُن کی تمکنت کو بھی
جھکا قدمون پہ لیکن ہر طلب سے بے نیاز آیا

مخالف تھی ہوا لیکن بہت ہوشیار ہر ساقی
وطن کے میکدے مین لیکے مینا سے حجاز آیا

بوقتِ شام پہنچے قافلے والے دوراہے پر
کہان ڈوبا ہر سورج جب مقامِ امتیاز آیا

نظر کا دائرہ محدود، دل محرومِ دانائی
اسی کا نام جینا ہے تو مین جینے سے باز آیا

وہ میری باہمی وحدت کا رشتہ کیا ہوا یا رب
چھپا کا شا عجم مین تو عرب سے چارہ ساز آیا

ابھی تک یاد ہے ساحل پہ یا حجاج کا نعرہ
کہ اک مظلوم کی فریاد پر پورا جہاز آیا

ضرورت تھی کہ نازِ بندگی کی شان بھی ہوتی
ترے حصے مین اے زاہد فقط ذوقِ نیاز آیا

وہ شانِ امتیاز ارشاد تھا تو ہو گیا مستیکہ مجھ
مساوات اس قدر محمود کی صف مین ایاز آیا

سلام اے کشمیر و اجمیر کے خاموش ویرانو
پھرین گے پھر تمھارے دن جو کوئی پاکباز آیا

شفیقِ جونپوری کو خدا رکھے زمانے مین
اٹھا اقبال تو یہ دو مرادانائے راز آیا

"آدم"

از جناب چودھری وزیر حسن صاحب نشتر سندیلوی

جہان مین نکتہ سنج و نکتہ بین و نکتہ در تو ہی
کتابِ کن فکان کی مبتدا تو ہی خبر تو ہی

تو آیا ہے جہان مین رازِ قدرت کا امین ہو کر
ہی خود پیغام نازان جس پہ وہ پیغامبر تو ہی

تجھے ہوتا نہین کچھ رفعتون کا اپنی اندازہ
تری حدِ نظر منزل ہے، پابندِ نظر تو ہی

نہین اٹھتے مگر پردے تری آنکھون سے غفلت کے
عطائے خاص رب العالمین سے بہرہ ور تو ہی

خود اپنے جادۂ منزل سے ہی بھٹکا ہوا ورنہ
فرشتون کو بھی جس پر رشک ہو ایسا بشر تو ہی

ستارے ہین فلک کے تیری گردِ راہ کے ذرے
خبر تجھکو نہین منزل کی، غافل! بے خبر تو ہی

بنا کردند خوش، از طینتِ آدم جہانے را
ز مشتِ خاکِ ما تعمیر کردند آسمانے را

غزل

از جناب خان بہادر مولوی انعام الرحمن صاحب نعمانی وحشت ردولوی

بہت لوٹین بہارین ہم نے وحشت حسنِ جانان کی
مگر پھر بھی شکایت رہ گئی تنگیٔ دامان کی

رہی گی تا بہ کے صحرا نوردی تیرے مجنون کی
بجا ہین بڑھ گئی ہین وسعتین کتنی بیابان کی

نقابِ رخ یہ کس کافر ادا نے آج الٹی ہے
فروزان ہو گئی ہین ساری شمعین بزمِ امکان کی

مگر ذوقِ عمل ہو جائے پیدا ان اسیرون مین
تو گر جائیگی خود ہی دیکھنا دیوار زندان کی

ستائش کس زبان سے مین کرون قاصر ہی گویائی
کسی کے جورِ بیجا کی نوازشہائے پنہان کی

الٰہی ٹیس کیون رہ رہ کے اٹھتی ہے مرے دل مین
کہین پھر یاد تو آتی نہین اس آفتِ جان کی

نگاہِ مست سے مخمور سارے اہلِ محفل ہین
یہ کس کو ہوش ہے لوٹے بہارین حسنِ جانان کی

دمِ نظارہ کوئی دیکھے تو آکر حالت وحشت
نمایان رخ سے کل کیفیتین ہین سوزِ پنہان کی

مطبوعات جدیدہ

خیر کثیر، مترجمہ مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور تقطیع اوسط، ضخامت ۲۸۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ:- ابنار مولوی محمد بن غلام رسول سورتی تاجران کتب نمبر ۱۳۲ / ۱۳۴، جامع مسجد بمبئی نمبر ۳،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جس زمانہ مین پیدا ہوئے، وہ ہندوستان کے مسلمانون کے انحطاط کا انتہائی دور تھا، اور سیاسی زوال کے ساتھ اُن کے مذہب و اخلاق اور علم و فن سب پر زوال طاری ہو گیا تھا، مذہب قرآن و حدیث کے چشمۂ صافی کو چھوڑ کر منطقیانہ اور متکلمانہ موشگافیون اور ہندوانہ رسوم و اوہام اور تصوف بدعات اشراقی فلسفہ اور ہندی ویدانت کا مجموعہ بن گیا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اسکی اصلاح کے لئے جو کتابین لکھین ان مین خیر کثیر نہایت اہم ہے، اس مین شریعت کے احکام دین کے اسرار اور تصوف کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی مین نکھار کر ایسے انداز مین پیش کیا گیا ہے کہ شریعت کا دامن بھی ہاتھ سے نہین چھوٹتا ہے، اور عقلی حیثیت سے بھی وہ دل نشین اور قابل قبول ہین، مذکورۂ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، خیر کثیر کے مباحث نہایت دقیق ہین، ایسے مباحث کا سلیس اور قابلِ فہم ترجمہ بہت مشکل ہے تاہم مصنف نے مفہوم کی وضاحت کی پوری کوشش کی ہے، یہ کتاب اصحاب علم و نظر مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

تدوینِ قرآن، مرتبہ جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم اے عثمانیہ تقطیع اوسط، ضخامت ۱۰۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲؍، پتہ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

مرتب نے مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی زیر نگرانی ایم اے کے امتحان کے لئے قرآن مجید کے تحفظ اور اسکی تدوین کی تاریخ پر یہ مقالہ لکھا تھا جس کو مکتبہ برہان نے کتابی صورت مین شائع کر دیا ہے، اس مقالہ کی تدوین مین اگرچہ بعض کتابون سے بھی مدد لی گئی ہے، لیکن زیادہ تر مولانا ہی کے افادات پر مشتمل ہے، اس مین قرآن مجید کی داخلی اور حدیث و تاریخ کی خارجی شہادتون سے ثابت کیا گیا ہے، کہ قرآن مجید آج جس ترتیب کے ساتھ اور جس شکل مین موجود ہے، اسی شکل مین وہ عہد نبوی مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و نگرانی مین مرتب اور تحریر ہو چکا تھا، اور خلفائے راشدین کے زمانہ مین اس مین کوئی ترمیم و تنسیخ نہین ہوئی، اور ان غیر معتبر روایتون کی پوری تردید کی گئی ہے، جن سے کلام مجید مین رد و بدل کے شبہات یا کم از کم اسکی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس موضوع پر اردو مین متعدد مضامین بلکہ بعض کتابین بھی موجود ہین، لیکن مولانا نے اس مین جو نکتے پیدا کئے ہین، خصوصاً حذف و اضافہ کی غلط فہمیون کا جس طرح ازالہ کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے، مولانا نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جو ابھی شائع نہین ہوئی ہے، یہ مختصر رسالہ اسی کا خلاصہ ہے، اور اس مین تحفظ قرآن کے تمام ضروری اور اہم پہلو آگئے ہین،

اسلامی اصولِ انتخاب از جناب نعیم صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ :- مکتبہ چراغ راہ نمبر ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ، کراچی نمبر ۱-

مصنف نے جو جماعت اسلامی کے مشہور اہل قلم ہین، اسلامی اصول انتخاب پر یہ کتاب لکھی ہے، اس مین حکومت کے بارہ مین اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے، اور حکومت الٰہیہ اور انسانون کے بنائے ہوئے نظامہائے حکومت کا بنیادی فرق واضح کرکے اسلام کی پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور خلفائے راشدین کے انتخاب کے واقعات سے اسلامی انتخاب کے اصولون کو مستنبط کرکے اُن کی روشنی مین موجودہ زمانہ کے لئے اسلامی انتخاب کے اصول بتائے گئے ہین، اصولی حیثیت سے

مصنف کا نقطۂ نظر بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کی تفصیل مین اختلاف کی گنجایش نکل سکتی ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے اس موضوع پر مفید کتاب ہے،

عہدِ نبوی کا نظامِ حکمرانی از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن،

عہد نبوی کی تاریخ فاضل مصنف کا خاص موضوع ہے، زیر نظر کتاب اس موضوع پر ان کی مشہور تالیف ہے، اس مین عہد نبوی کے نظام حکومت پر محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور اس کے سیاسی، انتظامی، عدالتی اور تعلیمی پہلوؤن کو تحقیق کے ساتھ دکھایا گیا ہے، اس کتاب کے پہلے اڈیشن پر معارف مین مفصل ریویو ہو چکا ہے، اس دوسرے اڈیشن مین کوئی خاص اضافہ نہین ہے، مصنف کی دوسری کتابون کی طرح یہ کتاب بھی اس کی تلاش و تحقیق اور وسعت و دقتِ نظر کا نمونہ ہے،

سیاسی ادارت از جناب رحمت علی صاحب ایم اے عثمانیہ تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت عہ، پتہ رضوی اینڈ کمپنی نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن،

انسانی ترقی کے ساتھ اس کے بنائے ہوئے حکومتی نظام بھی درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ شکل تک پہنچے ہین، اُن کے ارتقاء کی تاریخ فن سیاست کا اہم اور دلچسپ پہلو ہے، لائق مؤلف نے اس کتابچہ مین ان نظامون کے ابتدائی دور یعنی قدیم یونانی شہری مملکتون کے قیام کے زمانہ سے لے کر رومی شہنشاہی، قرون وسطیٰ کے کلیسائی اور جاگیردارانہ نظامون، مطلق العنان بادشاہتون اور جدید یورپ کے جمہوری اور عوامی نظامون کے آغاز تک، حکومتی نظامون کے ارتقا کی مختصر سرگذشت بیان کی ہے،

جارج برناڈشا از ظ انصاری صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی،

اس کتاب مین مشہور ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈشا کے سوانح اور اخلاق و عادات قلمبند

کئے گئے ہین، اور انکی ادبی تنقیدی، طنز نگاری، فلسفیانہ اور سیاسی حیثیتون تبصرہ کیا گیا ہے، آخر مین اس کے چار مشہور ڈرامون کا خلاصہ دیدیا گیا ہے، اس طرح اُس مین اختصار کے ساتھ برناڈشا کے متعلق تمام ضروری معلومات آگئے ہین،

اصلاحاتِ اقبال از جناب بشیر الحق صاحب دسنوی عظیم آبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ نمبر ۴-

مؤلف نے چند دن ہوئے اصلاحاتِ اقبال کے عنوان سے معارف مین ایک مضمون لکھا تھا، جس مین بڑی تلاش و محنت سے سر اقبال مرحوم کے کلام پر خود اُن کی اصلاحون کو جمع کیا تھا، اب اسکو کتابی صورت مین شائع کر دیا ہے، یہ کتاب شاعرون خصوصاً کلامِ اقبال سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

مشامِ روح از جناب تابان قادری کلکتوی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت مجلد عہ، پتہ:- مکتبہ قادریہ نمبر ۲ خانقاہ شریف لین کلکتہ نمبر ۱۴،

اردو زبان کو کلکتہ سے بہت قدیم تعلق ہے، اسی کے فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کو تالیف و تصنیف کی زبان بنایا، اس تعلق کے اثرات ہر دور مین قائم رہے، اور ہر زمانہ مین یہان شعر و ادب کا چرچا رہا، مصنف مشامِ روح بھی اس سرزمین کے ایک جونہار شاعر ہین، ان کا کلام شاعری سے اُن کے فطری ذوق اور مناسبت کا شاہد ہے، اور اس مین تغزل کی تمام خصوصیات وخوبیان موجود ہین بعض بعض اشعار تو مصنف کے قلم سے ایسے نکل گئے ہین کہ بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہین اگر اُن کی مشقِ سخن جاری رہی تو وہ نوجوان شعرا مین ممتاز جگہ حاصل کر لین گے، لیکن ایک مجموعہ کے لئے اتنے دیباچون، تبصرون اور تعارفون وغیرہ کا انبار ذوقِ سلیم پر بار گزرتا ہے،

"م"

جلد ۶۸   ماہ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء   عدد ۶

مضامین

تصحیح:- (۱) معارف دسمبر ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۴۱۳ سطر ۲ مین سہو قلم سے غلام یٰسین کے بجائے "غلام محی الدین احمد ابوالکلام کے بھائی" چھپ گیا ہے جو غلط ہے، صحیح نام غلام یٰسین ہے جیسا کہ حیاتِ شبلی ص ۵۰ مین تحریر ہے، "س" (۲) معارف کے اس نمبر (دسمبر ۱۹۵۱ء) ص ۴۲۵ سطر ۳ مین "انگریزی سے ترجمہ" کے بجائے "انگریزی مین ترجمہ" پڑھا جائے، "م"